فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۹۰

جولائی ۱۹۶۲ء تا دسمبر ۱۹۶۲ء

(بہ ترتیب حروفِ تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری	۱۵۱-۶۰	۸	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین	۴۴۴-۳۱۰
۲	جناب ڈاکٹر اکمل ایوبی صاحب، ادارۂ علوم و فنون مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۳۹۳	۹	جناب عبد الرؤف صاحب ایم اے لکچرار شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی	۱۴۴
۳	جناب ڈاکٹر ام ہانی فخر الزماں صاحب، ریڈر شعبۂ فارسی ویمنس کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۲۰۵	۱۰	جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی	۷۵
			۱۱	جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی	۱۴۲
۴	جناب بشیر الحق صاحب دسنوی	۲۳۲	۱۲	جناب ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (سندھ)	۳۹۴-۷۲
۵	جناب پروفیسر سید حسن صاحب، پٹنہ	۲۶۹			
۶	جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے	۵۰۴-۴۴ ۴۵۸-۲۶۶	۱۳	جناب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی	۱۵۸-۷۷ ۳۱۷-۲۳۹ ۴۷۷-۲۹۷
۷	جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے	۸۵-۵ ۲۴۵-۱۶۵ ۳۶۵	۱۴	جناب مولوی شاہ محمد شبیر عطا صاحب ندوی	۳۸۱-۲۹۶ ۴۲۵

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱۵	جناب ڈاکٹر محمد عرفان صاحب ایم اے لکچرار شبلی ڈگری کالج اعظم گڈھ	۴۴۹		**شعراء**	
			۱	جناب اختر مسلمی اعظمی	۳۰۹
۱۶	جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب ایم اے حیدرآباد سندھ	۱۰۹-۲۹، ۳۴۹-۱۸۹، ۴۰۵	۲	جناب انقر موہانی	۳۰۸
			۳	جناب تسکین قریشی	۳۰۹
۱۷	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۶۲،۸۲،۲، ۳۲۰،۲۴۲، ۴۰۲	۴	جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری	۲۳۴-(۱)
			۵	جناب زائر حرم حمید صدیقی	۱۵۷
۱۸	جناب حکیم منظور الحسن صاحب برکاتی ٹونک	۲۲۶	۶	جناب ساجد امیٹھوی	۲۳۵
۱۹	جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۱۳۶	۷	جناب کریم ارضا خاں صاحب وکیل شاہجہانپور	۲۳۴-۰
			۸	جناب گویا جہان آبادی	۴۶۲
			۹	جناب یحییٰ اعظمی	۱۵۶

فہرست مضامین معارف

جلد ۹۰

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۱۶۲،۸۲،۲، ۳۲۲،۲۴۲، ۴۰۲	۹	علامہ اقبال اور مسئلہ زمان	۴۴
			۱۰	غزلیات ظہیر اور ان کا مصنف	۱۳۶
	مقالات		۱۱	کچھ مظہر کے بارے میں	۲۶۹
۱	اردو کے چند مظلوم ادیب	۱۴۲	۱۲	کچھ مظہر کے سلسلے میں	۴۵۸
۲	المسعودی	۲۹۶، ۳۸۱، ۴۳۵	۱۳	مثنوی مولانائے روم کا ایک اہم مخطوطہ	۳۵۳
۳	خیام کا قدیم ترین تذکرہ	۲۸۴، ۳۶۶	۱۴	مخزن نکات	۴۴۹
۴	دو نایاب تحریریں	۷۵، ۲۳۲	۱۵	"تذکرہ احباب" کا تنقیدی جائزہ	۲۰۵
۵	دیوان ظہیر اور اس کا مصنف	۷۲	۱۶	نارجیل سے نخیل تک	۶۰-۵۱!
۶	شاہ محمد غوث گوالیاری	۲۹، ۱۰۹، ۱۸۹، ۳۴۹، ۴۰۵	۱۷	ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	۵، ۸۵، ۱۶۵، ۲۴۵، ۳۲۵
۷	ظہیر فاریابی	۲۲۶، ۳۹۶		**ادبیات**	
۸	عربی کے ہندی الاصل الفاظ	۱۴۴	۱	حقائق و معارف	۳۰۸

جلد ۹۰ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۲ء عدد ۱

مضامین

مقالات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

الجزائر کی آزادی پوری دنیائے اسلام کے لیے نوید مسرت ہے، الجزائر کے مجاہدوں نے آزادی کے لیے جتنی قربانیاں کی ہیں وہ جنگ آزادی کی تاریخ میں بے مثال ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ افسوسناک پہلو بھی ہے کہ آزادی ملنے کے ساتھ اندرونی اختلافات شروع ہو گئے، گو آزادی بہت بڑی نعمت ہے لیکن اس کو سنبھالنے اور ملک کے استحکام و ترقی کے مراحل بھی آزادی سے کم اہم نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ صبر آزما ہیں، یہ اسلامی ملکوں کی بدقسمتی ہے کہ ان میں وحدت خیال نہیں، اس لیے آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، اسلامی ملکوں میں بھی باہم اتحاد و اتفاق نہیں، انکی جغرافی پوزیشن یہ ہے کہ ترکی سے لیکر شمالی افریقہ تک اسلامی ملکوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے، وہ مغربی اور وسط ایشیا و افریقہ کے بڑے اہم حصوں اور یورپ کے بعض اہم ناکوں پر قابض ہیں، انکی سرزمین معدنی ذخائر سے مالا مال ہے، اسکے باوجود سیاسی دنیا میں انکی کوئی آواز نہیں، اگر ان میں اتحاد و اتفاق ہوتا اور وہ کسی ایک سلسلہ میں منسلک اور اقتصادی حیثیت سے مضبوط ہوتے تو بین الاقوامی دنیا میں ان کا ایک وزن ہوتا، انکی آواز بھی موثر ہوتی، مگر یہ وہ خواب ہے جس کی تعبیر کی مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں ہے، یہی غنیمت ہے کہ جو ملک مغربی قوموں کی غلامی میں اسیر تھے وہ رفتہ رفتہ آزاد ہوتے جاتے ہیں، اور ادھر چند برسوں کے اندر کئی مسلمان حکومتیں قائم ہو گئیں، آزادی اور حکومت اللہ تعالےٰ کا بہت بڑا عطیہ ہے، جو اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک اس کا حق ادا کیا جائے، ورنہ یہ دولت کسی دوسری اہل قوم کیجانب منتقل ہو جاتی ہے جس کا تجربہ صدیوں سے مسلمانوں کو ہو رہا ہے، اسکے باوجود انکو سبق حاصل نہیں ہوتا۔

گپتا منسٹری نے اردو کے بارہ میں جو توقعات خوش فہموں نے قائم کی تھیں وہ تعلیم کے سہ لسانی فارمولے نے بالکل ختم کر دیں، اس کے متعلق جو بیان حال میں اخبارات میں شائع ہوا ہے اس میں یہ صراحت ہے کہ "اگر طلبہ کو اردو بحیثیت تیسری زبان کے اختیار کرنے کا حق دیا گیا تو ان کی ایک بڑی تعداد اردو ہی کو تیسری زبان بنا لے گی،

کیونکہ جنوبی ہند کی زبان کے مقابلہ میں ان کے لیے اس زبان کا سیکھنا آسان ہوگا، اس طرح سہ لسانی فارمولے کا مقصد ہی فوت ہو جائیگا یعنی شمالی اور جنوبی ہندوستان میں ہم آہنگی پیدا کرنا، اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ جو طلبہ اردو کے اپنی مادری زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو اردو کو بحیثیت تیسری زبان کے لینے کی اجازت دینا منصفانہ نہ ہوگا،"

یعنی ہندی اور انگریزی تو لازمی ہوگی اور تیسری زبان جنوبی ہند کی کوئی زبان ہوگی، اس طرح اردو کا قصہ خود بخود ختم ہو جائیگا، یہ ہم آہنگی کی بالکل نئی قسم ہے کہ جو زبان صدیوں سے ہم آہنگی کا ذریعہ چلی آرہی ہے اسکو تو ختم کر کے ایک ہی صوبے کے باشندوں میں ہم آہنگی کا جنازہ نکال دیا جائے اور جنوبی ہند کی زبانوں کے ذریعہ شمال و جنوب کے دور دراز علاقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کیجائے، یہ ہم آہنگی پیدا کرنے کا مخلصانہ جذبہ نہیں بلکہ صرف طاقت کا خوف ہے، ورنہ جس صوبے میں ہندی کی اتنی شدید مخالفت بلکہ اس سے نفرت کیجاتی ہو کہ اس کے حروف کو چھیل کر مٹایا جاتا ہو، ہندوؤں کی مقدس کتابوں کو نذر آتش کیا جاتا ہو، ڈروادستان قائم کرنے کی دھمکی دیجاتی ہو اس کی زبان کی تعلیم تو اتر پردیش میں لازمی قرار دیجائے اور جو درحقیقت اس صوبہ کی عام یا کم سے کم ثانوی زبان ہے، اس کی تعلیم کی گنجائش ہی نہ رکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی پشت پر قوت اور اس کو منوانے کے لیے قربانی کا حوصلہ نہ ہو وہ محض دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ نہیں رہ سکتی، اگر اردو کے حامیوں میں بھی قوت ہوتی اور وہ اس کے لیے قربانی کر سکتے تو اسکا یہ انجام نہ ہوتا، مگر وہ تو مجبور محض ہیں، یہ محض خوش فہمی ہے کہ مسلسل کوشش سے جمہوریت ایک نہ ایک دن حقدار کا حق ماننے پر مجبور ہوتی ہے، اس کا تجربہ ۱۴ سال سے ہو رہا ہے کہ اردو والوں کی مسلسل کوشش کے باوجود آج تک کوئی شنوائی نہیں ہوئی، اگر کبھی اردو کی حق شناسی کے کچھ آثار بھی نظر آتے ہیں تو ایسی صورتیں پیدا کر دیجاتی ہیں کہ اس کا قدم اور پیچھے ہٹ جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ جمہوریت جمہور کے مطالبہ کو زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کر سکتی لیکن اردو کو تو فرقہ وارانہ مسئلہ بنا دیا گیا ہے، وہ جمہوری کارہ کہاں گیا اور اب کسی اقدام

کے بغیر آسانی سے اردو کا حق ملنے کی بظاہر کوئی امید نہیں۔

مسلمانوں کو آئے دن جن نئی نئی آزمایشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ آیندہ بیسک سکولوں کے طلبہ کو ہندو تہواروں کے منانے کی عملی تعلیم دی جائے گی، اور ان میں جو مشرکانہ رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ مسلمان بچوں کو بھی ادا کرنا پڑیں گی، اس کے متعلق قاضی عدیل صاحب عباسی کا مفصل مضمون اردو اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو یہ مسلمانوں کے لیے ایک نئی آزمایش ہے، بیسک ریڈروں کے خرافات ہی کیا کم تھے کہ یہ ایک نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا، جو ان خرافات سے بھی زیادہ قابل اعتراض ہے، تفہیم ہی کی غرض سے سہی، ہر چیز کی عملی تعلیم دینا کیا ضروری ہے، تفہیم زبانی بھی ہو سکتی ہے، اس سے قطع نظر کیا کوئی ہندو یہ گوارا کرے گا کہ مسلمانوں کے تہوار، عید و بقرعید کو سمجھانے کے لیے ہندو بچوں سے عید کی نماز پڑھوائی اور قربانی کرائی جائے، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مسلمان بچوں کو ہندو تہواروں کی عملی تعلیم پر کیوں مجبور کیا جائے، ہم کو امید ہے کہ شعبۂ تعلیم کے ذمہ دار اس لغو تجویز کو خارج یا مسلمان بچوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیں گے۔

کشمیر دوسری ترقیوں کے ساتھ علمی میدان میں بھی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، وہاں متعدد علمی و ادبی مجالس قائم ہیں اور ہر سال اصحاب علم و ادب کا اجتماع ہوتا رہتا ہے، ابھی حال میں کشمیری ثقافت اور کشمیر میں بولی جانے والی زبانوں کے فروغ و ترقی کے لیے "جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے، اس کی جانب سے اردو میں ایک دو ماہی رسالہ بھی شیرازہ کے نام سے نکلا ہے، اس کے نگراں سید علی جواد زیدی اور اڈیٹر محمد یوسف ٹینگ ہیں، زیدی صاحب علم و ادب کا بڑا صحیح اور سنجیدہ مذاق رکھتے ہیں، اس لیے توقع ہے کہ ان کی نگرانی میں یہ رسالہ مفید علمی و ادبی خدمت انجام دے گا۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از
جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم، اے

(۴)

علماء اور امراء شاہان مغلیہ کے عہد میں بھی بعض بہت ہی اچھے امراء تھے، عبدالرحیم خانخاناں کے دربار سے شیعی اور سنی دونوں علماء وابستہ رہے، ان میں مولانا میاں وجیہ الدین، مولانا غازی خاں بدخشی، قاضی نصیر الدین برہانپوری، ملا خیر الدین رومی، مولانا جلال الدین حسن نیشاپوری، مولانا شیخ عبداللہ، مولانا شیخ ابراہیم، مولانا شیخ علم اللہ، مولانا صوفی، ملا محمد علی کشمیری، مولانا میر دوستی سمرقندی، میر عبدالباقی تبریزی، میر فیض اللہ تخورانی، ملا خوشحال تاشکندی، مرزا محمد قاسم گیلانی، آقا جلال قزوینی، قاضی عبدالعزیز ہمدانی، مولانا محمد تقی کاشانی، مولانا مقصود علی تبریزی، مولانا محمد رضائی، تاج مشہدی اور حکیم کمال الدین حسین شیرازی قابل ذکر ہیں، عبدالرحیم خان خاناں کی خط و کتابت حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے بھی رہی، جس کے مطالعہ

سے اندازہ ہوتا ہے کہ امارت کے باوجود اس کا دینی شعور بیدار تھا، اور وہ شیعہ سنی کے جھگڑوں سے
بالاتر ہو کر دینی حمیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا،

جہانگیری امرا میں شیخ فرید مرتضیٰ خاں بخاری کو بھی علماء اور مشائخ سے بڑا گہرا تعلق تھا حضرت
باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ دونوں اس کی گوناگوں خوبیوں کے معترف تھے، اکبری عہد میں وہ
بخشی کے عہدے پر مامور تھا، جہانگیر کی جانشینی میں اس کا بڑا دخل تھا، اسی لیے جہانگیر نے اس کو میر بخشی کا
عہدہ عطا کیا، پھر گجرات اور پنجاب کا صوبہ دار بھی مقرر ہوا، وہ اپنے گھر سے نکلتا تو راستہ میں مسکینوں
کو کمل، چادر اور کپڑے تقسیم کرتا جاتا، کسی کو نقد روپیہ اور کسی کو اشرفی دیتا، بیواؤں اور حاجتمندوں
کے لیے اس کے یہاں سے یومیہ، ماہانہ اور سالانہ وظیفے مقرر تھے، غریب لڑکیوں کی شادی کے جہیز
کا سامان بھی کرتا، اس کے دسترخوان پر روزانہ پانچ سو سے ایک ہزار تک آدمی کھانا کھاتے تھے،
اس میں بڑی دینی غیرت وحمیت تھی، اور وہ مذہبی شعائر کو رواج دینے کے لیے بے چین رہتا، اکبر
کے دین الٰہی کی مذہبی گمراہیوں کو دور کرنے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو تجدیدی اور اصلاحی
اقدام اٹھائے، ان میں وہ بڑا معاون ہوا، اسی کے اصرار پر جہانگیر نے اپنی جانشینی کے بعد حکم دیا کہ
ملکی نظم ونسق میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہونے پائے، حضرت مجددؒ، شیخ فرید کے ان مساعی جمیلہ
کے ممنون رہے، اس کی شان میں یہ شعر لکھتے ہیں:

گر برتن من زباں شود ہر موئے   یک شکر تو از ہزار نتواں کرد

ایک دوسرے مکتوب میں اس کو لکھتے ہیں کہ ہم فقیروں پر آپ کے احسانوں کا شکر لازم ہے، کیونکہ ہمارے
حضرت خواجہ قدس سرہ کی ظاہری جمعیت کا سبب آپ ہی ہوئے تھے، اور اس جمعیت کی حالت
میں آپ کی طفیل میں ہم نے حق سبحانہ کی طلب کی اور بہت فائدے حاصل کیے، شیخ عبدالحق محدث
دہلوی بھی اس کو احیائے سنت وشریعت کے لیے برابر خطوط لکھتے رہے، ماثر الامراء کے مصنف نے

اس کی بہت سی خوبیوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ اس کے ایسا آدمی پھر زمانہ نے ہندوستان میں پیدا نہیں کیا،

حضرت مجددؒ نے جہانگیر کے ایک دوسرے جلیل القدر امیر خان اعظم کی دینی حمیت سے بھی
فائدہ اٹھانا چاہا، اس کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے
رکے ہوئے ہیں اور ان احکام کے بجالانے پر مطعون ہیں، شرع شریف کی رونق بادشاہوں پر
منحصر ہے، لیکن اب قصہ برعکس ہو گیا ہے اور معاملہ بدل گیا ہے، ہائے افسوس! صد افسوس!
ہم ایسے نازک وقت میں آپ کے وجود مبارک کو غنیمت جانتے ہیں، اس معرکہ ضعیف میں آپ کے
سوا کسی اور کو بہادر نہیں جانتے، آپ کے مسلمان ہونے کی عزت ہمسروں کی نظروں میں ظاہر ہے،
کوشش فرمائیں کہ زیادہ نہ سہی تو اتنا تو ہو کہ اہل اسلام بیہودہ عملی باتوں سے محفوظ رہیں، اللہ تعالیٰ
آپ کو جزائے خیر دے، پہلی حکومت میں دین مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی مفہوم ہوتی
تھی، اس حکومت میں ظاہری طور پر وہ عناد نہیں ہے، اگر ہے تو بے علمی کے باعث ہے، ایسا نہ ہو
عناد و دشمنی تک نوبت پہنچ جائے، اور مسلمانوں پر معاملہ اس سے بھی زیادہ تنگ ہو جائے، حق تعالیٰ
آپ کو اور ہم کو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت پر ثابت قدم رکھے،

جہانگیر کے امراء میں خانجہاں لودی بھی بڑا مذہبی واقع ہوا تھا، شیخ فضل اللہ برہان پوری
کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، رات اکثر علماء اور صوفیہ کی صحبت میں گذارتا تھا، اس کی سرکار
میں کسی قسم کی بدعت کا رواج نہ تھا،

مہابت خاں کے لڑکے خان زماں بہادر مرزا امان اللہ کے بارہ میں ماثر الامراء کے مصنف
کا بیان ہے کہ "بخوبہادر امثال واقران سر برتری می افراخت"

شاہجہانی عہد کے امراء میں افضل خاں، علامی شکر اللہ شیرازی، علامی سعد اللہ خاں اور
دانشمند خاں میر بخشی کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں، یہ تینوں معقولات ومنقولات کے عالم تھے،

شاہجہاں کے عہد میں افضل خاں، علامی شکراللہ شیرازی دیوان کل کے عہدے پر فائز ہوئے تو کسی نے تاریخ کہی ع

شد فلاطون وزیر اسکندر

علامی سعداللہ کی تقریر کی بلاغت اور تحریر کی فصاحت مشہور تھی، ان کے مذہبی معلومات، علمی لیاقت، حسن اخلاق، تواضع اور دیانتداری سے عہدۂ وزارت کو وقار حاصل تھا،

عالمگیر اپنے میر بخشی دانشمند خاں اور ملا شفیعائی یزدی کو ان کے علم و فضل اور نیک نفسی کی وجہ سے بہت عزیز رکھتا تھا، مآثر الامراء کے مصنف نے لکھا ہے،

"پس از وتا حال از دنیاں بلند مقدار کسے کہ فضیلت را با امارت جمع کردہ باشد در عرصۂ روزگار نیامدہ"

مغل بادشاہوں کے آخری دور میں نجیب الدولہ کے یہاں نو سو علماء تھے، جو پانچ پانچ سے پانچ سو روپئے تک وظائف پاتے تھے، اس نے نجیب آباد میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، جو شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک کا ایک زبردست مرکز تھا، شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی حکومت کو سنبھالنے کی کوشش میں اس سے بڑی مدد حاصل کی،

ان کے علاوہ بہت سے امراء ایسے بھی تھے جن کی سپہ گری، جانبازی اور پامردی سے ہر زمانہ میں حکومت کو بڑی تقویت پہنچتی رہی، ان کے تدبر اور ہوشمندی سے حکومت کا وقار بڑھتا گیا، اسی لیے علماء ضرورت کے وقت ان سے مدد لیتے رہے،

لیکن مجموعی حیثیت سے امراء کا اخلاق اور کردار بہت زیادہ قابل تعریف نہیں رہا، اس میں شک نہیں کہ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عروج کے زمانے میں زیادہ تر امراء ایسے تھے، جن کی فوجی اور حربی قیادت سے حکومت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی، وہ حصار اور میدان

کی لڑائیاں جس طرح لڑتے رہے، ہندوستان کی جنگی تاریخ کا غیر معمولی کارنامہ ہے، سندھ میں برہمن آباد کے قلعہ کا دور چار میل تھا، جو سد سکندری سے زیادہ مضبوط سمجھا جاتا تھا، گوالیار کے قلعہ کے بارہ میں تاج المآثر کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ اتنا اونچا تھا کہ تیز اور تند ہوا بھی اس کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتی تھی، ارنگل کے قلعہ کے بارہ میں امیر خسرو لکھتے ہیں کہ اس کی دیوار اتنی سنگین تھی کہ لوہے کی اینٹ بھی اس سے زیادہ مضبوط نہیں بنائی جا سکتی تھی، سنگ مغربی اس سے ٹکراکر واپس آجاتا تھا، رن تھنبور کی اونچائی اور مضبوطی کو دیکھ کر ابو الفضل متحیر ہو گیا تھا، لکھتا ہے کہ خیال کی منجنیق بھی اس کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتی تھی، چتوڑ کے پہاڑی قلعہ کا دور آٹھ میل کا تھا، آسام کے قلعوں میں سری گھاٹ، نانڈو اور سملا گڑھ کا ذکر کرتے وقت عالمگیر نامہ کا مصنف بے حد متحیر ہو گیا تھا، ان سب قلعوں کو فوجی امراء نے اپنی پامردی اور جانبازی سے فتح کیا اور ہندوستان کا شاید ہی کوئی قلعہ ایسا رہ گیا تھا جس کو انھوں نے تسخیر نہ کیا ہو، اسی طرح میدان کی لڑائیوں میں اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی، ظفر خاں، الپ خاں، ملک کافور، خان عالم، منعم خاں خانخاناں، عبد الرحیم خان خاناں، خان زماں، بہادر خاں، ابراہیم خاں، سید عبد الوہاب، ذو الفقار خاں، امیر الامراء سید حسین خاں اور قطب الملک سید عبد اللہ خاں وغیرہ جس جوش و خروش شجاعت اور تہور سے لڑتے رہے، ان پر آج بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ اپنی سپاہیانہ خدمات کا صلہ حاصل کرنے کیلئے دربار کے اندر جس اخلاق و کردار کا نمونہ پیش کرتے رہے وہ بہت زیادہ قابل تعریف نہیں، اور ان فوجی قائدین میں سے کسی میں بھی حضرت خالد بن ولید، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح، حضرت عمرو بن العاص، حضرت سعد بن وقاص اور حضرت سعید بن عامر کا ہلکا پرتو بھی نہیں پایا جاتا ہے، ایسا کیوں تھا؟ کیا وہ صرف حصول جاہ و منصب کے عرض سے مغلوب رہے، اور کیا ان میں مذہبی غیرت و حمیت نہیں رہی؟ سلاطین وقت جنگ کے موقع پر برابر ان کا مذہبی جذبہ ابھارتے رہے، شہاب الدین غوری

دوسری بار پرتھوی راج سے لڑنے کے لیے آیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام اور ہندو مذہب کی جنگ ہے، دکن میں جب جب فوجی امراء اپنی فوجیں لیکر گئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاد کرنے جا رہے ہیں، کنواہہ کی جنگ شروع ہونے سے پہلے بابر نے اپنے فوجی امراء کے سامنے جو تقریر کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجاہدوں ہی سے مخاطب تھا، اس نے کہا کہ ہم قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کا موقع دیا ہے کہ اگر ہم غنیم پر غالب آئے تو غازی کہلائے اور مرے تو شہید ہوئے، دونوں حال میں ہم کو بڑا درجہ اور بلند مرتبہ ملتا ہے، اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ تمام سرداروں نے کلام پاک کو ہاتھوں میں لیکر قسمیں کھائیں کہ وہ میدان جنگ سے کسی حال میں بھی منہ نہ موڑیں گے، اورنگ زیب دارا سے اپنے امراء کے ساتھ یہ کہکر سموگڈھ کی طرف روانہ ہوا کہ وہ شرعی اور اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، اور امراء اس سے متاثر ہوکر اس کے ساتھ ہوگئے،

ان امراء کے مذہبی جذبات کو علماء بھی دین کی خدمت کے لیے ابھارتے رہتے تو شاید وہ مجموعی حیثیت سے اتنے بُرے نہ ہوتے جتنے کہ تاریخ کے صفحات پر دکھائی دیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان کی امارت اور جاہ پسندی کی وجہ سے ان میں برائیاں پیدا ہوتی رہیں، پھر بھی وہ ایک بڑی قوت تھے، اسی لیے اچھے سلاطین ان کی برائیوں کو نظرانداز کرکے ان کے اچھے اوصاف سے برابر فائدہ اٹھاتے اور ان کو بڑی سی بڑی طاقت کے خلاف ٹکراتے رہے، علماء ان کی برائیوں کے نکتہ چیں تو ضرور تھے، لیکن ان کے عیش و عشرت کے قلعوں اور غفلت و بے عملی بلکہ دینی بے راہ روی کے حصاروں پر حملہ آور نہیں ہوئے، اور صرف وعظ و تلقین اور پند و نصائح کے ذریعہ ان کی اصلاح کی کوشش پر اکتفا کیا، اچھے سلاطین کی طرح ان کی قوت سے فائدہ نہیں اٹھایا، ان میں کوئی امیر مسجد بنا دیتا، مدرسے قائم کردیتا، بیواؤں اور مسکینوں کو خیرات دیکر

فیاضی کا ثبوت دیتا، عالموں کو اپنے دربار میں رکھ لیتا تو اسی کو غنیمت جانتے اور کبھی اجتماعی طور پر ان کی مذہبی غیرت و حمیت کو دین کے فروغ اور اسلام کی صحت مندانہ ترقی میں استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی، اگر حضرت مجدد الف ثانی کی خدمات سے قطع نظر کرلیا جائے تو مسلمانوں کی حکومت کے دور عروج میں علماء نے قائدانہ صلاحیت اور زعیمانہ قوت و نفوذ کا ثبوت نہیں دیا، اس لیے سلاطین کے بعد امراء ہی معاشرت کے قائد بنے رہے، اور چونکہ ان کی مذہبی حمیت صحیح طور پر ابھاری نہیں گئی، اس لیے ان کی امارت ان کی مذہبیت پر غالب ہوتی چلی گئی، اور اسی امارت کی خاطر ان میں باہمی بڑی کشمکش رہی جس سے پوری تاریخ بھری پڑی ہے، سلاطین دہلی کے عہد میں مملوک اور غیر مملوک، خلجی اور غیر خلجی، قرونہ ترک اور غیر قرونہ ترک، لودی اور غیر لودی امراء آپس میں لڑکر خونریزی کرتے رہے، مغلوں کے عہد میں افغان اور غیر افغان، ایرانی اور غیر ایرانی، ہندوستانی اور غیر ہندوستانی اور راجپوت اور غیر راجپوت امراء لڑے، اور امراء کا با اقتدار گروہ جس کا ساتھ دیدیتا وہی تخت و تاج کا مالک ہوجاتا، طاقتور حکمرانوں کے عہد میں امراء کی یہ آویزش دبی رہتی لیکن کمزور حکمرانوں کے آجانے سے پھر ابھر جاتی، ان کی اس آویزش سے مسلمانوں کی تاریخ کو بڑا نقصان پہنچا،

شیعہ سنی امراء کا تنازعہ

مغلوں کے آخری دور میں شیعہ اور سنی امراء کے جھگڑے بھی تکلیف دہ رہے، لیکن شیعہ اور سنی علماء ان جھگڑوں کو جس رنگ میں اب تک پیش کر رہے ہیں، اس سے ایک مورخ متفق نہیں ہوسکتا، یہ صحیح ہے کہ قطب الملک سید عبداللہ اور امیر الامراء سید حسین علی خاں، برہان الملک اور صفدر جنگ کی سرگرمیوں سے مغل حکومت کو نقصان پہنچا، لیکن اس کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ بیرم خاں خانخاناں، امیر الامراء شریف خاں، منعم خاں خانخاناں عبدالرحیم خانخاناں، اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ طہرانی، یمین الدولہ، آصف خاں

ابوالحسن مشہور بہ آصف جاہی، جملۃ الملک اسد خاں، شائستہ خاں اور میر جملہ وغیرہ کی جان بازی اور شمشیر زنی سے مغلوں کی حکومت کو غیر معمولی سربلندی بھی حاصل ہوئی، یہ صحیح ہے کہ سادات بارہہ نے فرخ سیر، رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا، لیکن ان ہی کے بعد احمد شاہ کی آنکھیں نکلوائی گئیں، عماد الملک کے ذریعہ عالمگیر ثانی کا قتل ہوا، اور ایک سنی امیر غلام قادر روہیلہ نے قلعہ معلی کے اندر داخل ہو کر نازنینان حرم کے پھول سے رخساروں کو طمانچوں سے سرخ کیا، اور نوک خنجر سے شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں، یہ پہلو بڑا ہی دردناک ہے کہ بنگال میں میر جعفر اور دکن میں میر صادق پیدا ہوئے، لیکن حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ بریلوی کی اسلامی تحریک کو بالاکوٹ میں دفن کرنے والے آخر کون تھے؟ اس کا جواب موجودہ دور کے ایک دیدہ ور عالم اور مورخ کے الفاظ میں یہ ہے کہ ان مجاہدوں کی تاریخ بتائے گی کہ ان کی تحریک کا یہ انجام کیوں ہوا، واقعہ چھپا اور اسباب نامعلوم نہیں، وہی جماعتوں کا نفاق اور امراء کا اختلاف ان کی ناکامی کا سبب ہوا، جو ہمیشہ سے ناکاموں کی ناکامی کا سبب بنا رہا ہے، پشاور کے پٹھان امراء اگر وفاداری سے کام لیتے تو آج ہندوستان کا نقشہ دوسرا ہوتا۔

شیعہ امراء سنی امراء ہی کی طرح اپنے اقتدار کی خاطر تخت و تاج سے الجھتے رہے، ان کی بادشاہ گری سنی امراء ہی کی طرح تھی، مملوک امراء نے بادشاہ گر بن کر التتمش کو تخت پر بٹھایا، خلجی امراء نے جلال الدین خلجی کے سر پر تاج رکھا، قرونہ ترک امراء نے غیاث الدین تغلق کو اپنا بادشاہ بنایا، لودی امراء نے خاندان سادات کو ختم کر کے بہلول لودی کو بادشاہ تسلیم کیا، مغلوں کے دور میں جنگ جانشینی کی لڑائی امراء ہی کے سہارے لڑی جاتی تھی، اسی طرح آخری دور میں سادات بارہہ بادشاہ گر ہو گئے تھے تو یہ محض ان کی اقتدار پسندی تھی لیکن اس اقتدار پسندی میں بھی تیموری خاندان کے احترام میں سنی بادشاہ ہی کو تخت پر بٹھاتے رہے، اور انھوں نے ان بادشاہوں کے ساتھ جو

ناروا سلوک کیا، وہ محض انکی سیاسی بازی گری تھی، اس کا تعلق ان کے مذہبی عقائد سے جوڑنا صحیح اور موزوں تجزیہ نہیں ہوگا۔ قطب الملک سید عبد اللہ خاں اور امیر الامراء سید حسین علی خان کے متعلق مآثر الامراء کے مصنف کا بیان ہے کہ

"اینہا از اعاظم سادات بارہہ اند، و اکابر شرفائے ہند۔ ہر دو برادر فرقدین فلک سیادت و نیرین سپہر امارت بودند، متحلی باکثر شمائل سنیہ، و خصائل رضیہ، خصوص سخاوت و شجاعت کہ ازیں دو صفت والا آثار غراء بظہور رسانند و نقشہائے کہ طراز صفحہ دولت باشد بر لوح روزگار نشانند و از مبادی ایام عروج تا منتہی نجو بلی و نیکنامی بسر بردند، و از آبیاری عدل و احسان عرصۂ ہند را رشک فردوس بریں بردند، لیکن در اواخر ایام دولت را غلط بہ نمودند و تا رُز قیامت داغ بدنامی با خود بردند۔"

ایک گروہ ایسا بھی ہے جو سادات بارہہ اور ان کے ہم خیال امراء کی سرگرمیوں کو مبالغہ آمیز طریقہ پر بیان کر کے مسلمانوں میں خواہ مخواہ مذہبی اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ہندوستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس ذہنی انتشار میں مبتلا نہیں ہو سکتے، غوریوں نے پنجاب میں غزنویوں کو ختم کیا، تیمور نے دہلی میں آکر خاندان تغلق کی حکومت پر ایک زبردست ضرب لگائی، سکندر لودی نے شرقی خاندان کو ختم کیا، بابر نے ابراہیم لودی کو پانی پت کی جنگ میں شکست دیکر بے شمار مسلمانوں کی لاشوں کا ڈھیر کر دیا، شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو ہندوستان چھوڑ کر جلاوطن ہونے پر مجبور کیا، اکبر مظفر گجراتی اور چاند سلطانہ کے خلاف برابر یلغار کرتا رہا، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے دہلی آکر جو خونریزی کی، اسکی تفصیل پڑھکر اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان میں فریقین سنی ہی تھے، اگر ان میں کوئی فریق شیعہ ہوتا تو سنی شیعہ کا سوال پیدا ہو جاتا، جیسا کہ عالمگیر کے زمانے میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی فوج کشی کو بنا دیا گیا ہے، اورنگزیب کے

تمام ننہالی رشتہ دار شیعہ تھے، اس کی بیوی دلرس بانو کے تمام اعزہ و اقربا بھی شیعہ ہی تھے، وہ دربار اور محل کے اندر زیادہ تر شیعی عقائد رکھنے والوں ہی سے گھرا رہتا تھا، اگر ان سب کو وہ محض شیعہ ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتا تو شاید اس کا ایک لمحہ بھی سکون و چین سے نہیں گذر سکتا تھا، سنیوں اور شیعوں میں مذہبی عقائد کے سلسلہ میں جو اختلافات اور لڑائیاں ہوئیں وہ اسلامی تاریخ کا بہت ہی المناک پہلو ہے، اس سے اسلام کو بڑا نقصان پہنچا، لیکن ان کی نوعیت شیعہ اور سنی امراء کے جھگڑوں سے بالکل الگ ہے، امراء کی آویزش کا مقصد اقتدار، جاہ اور منصب کے علاوہ کچھ اور نہ تھا،

مسلمان عوام علماء ان جھگڑوں کو بے بسی سے دیکھتے رہتے، حالانکہ وہ سلاطین اور امراء کو چھوڑ کر عوام کے دلوں کو تسخیر کرتے، تو سلاطین اور امراء دونوں کو اپنے سامنے جھکا سکتے تھے، اور مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کا اعلیٰ اور اونچا طبقہ ہر زمانہ میں اچھا نہیں رہا، بلکہ بعض زمانے میں بہت برا ہو گیا، جس سے ان کی تاریخ ہی بدل گئی، لیکن مسلمان عوام ہر زمانے میں اچھے رہتے ہیں، ان کا ظرف توحید و رسالت کی اعلیٰ تعلیم اور اسلام کی برتری کے احساس کی بدولت ہمیشہ سونے کا رہتا ہے، جس پر زمانہ کبھی زنگ لگا دیتا ہے، لیکن جب کبھی اچھے سنار کے ہاتھوں میں آجاتا ہے تو پھر کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے، اسی لیے یہی عوام لشکری بن کر اچھے سلاطین اور اچھے امراء کی قیادت میں بڑے بڑے جنگی اور حربی کارنامے انجام دیتے رہے، کبھی کونجی رن کے ہلاکت خیز صحراؤں میں پہنچے، کبھی اراکان کے دشوار گذار علاقوں میں داخل ہو کر دریائی جنگلوں سے گذرے، کبھی وندھیاچل کے پرپیچ اور تنگ راستوں کو طے کیا، کبھی تبت و ترکستان کی سرحد تک پہنچ کر اپنی شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھائے، کبھی ترجیل کے ہولناک دروں میں موت اور ہلاکت سے سینہ سپر ہوئے، کبھی ان کا دل بادل دریائے سرخاب اور کوہ ہندوکش کے برفانی

علاقوں سے گذرا، اور ان ہی کی نبرد آزمائی اور سپہگری سے حضرت کشمیر سے راس کماری تک ہندوستان کو جغرافیائی وحدت حاصل ہوئی، بلکہ ان کی وجہ سے ہندوستان کا پرچم کابل، قندھار، بست، بلخ اور بدخشاں پر بھی لہرایا، ان جنگی کارناموں پر کسی قوم کو بھی ناز اور فخر ہو سکتا ہے،

پھر یہی مسلمان اپنے سلاطین کے جامد مقلد بھی نہیں رہے، اچھے علماء کی قیادت میں کیا کچھ نہیں کیا، علماء ہی کے اثر سے اکبر جیسا وسیع المشرب اور روادار حکمراں ان میں مقبول نہ ہو سکا، انھوں نے حضرت احمد سرہندی کو مجدد وقت تسلیم کرکے اپنا سرتاج بنایا، تو جہانگیر جیسے تاجدار کو بھی ان کے سامنے جھکنا پڑا، محمد شاہ رنگیلے کے جانشین احمد شاہ اور اس کی ماں کو اندھا کیا گیا، تو وہ خوش تھے، آگے چل کر تیموری خاندان کے فرمانروا کو نظر انداز کرکے وہ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت اسمٰعیل شہید کے پیچھے جس طرح امڈے اس پر ان کی نسلوں کو آج بھی فخر ہے،

عالمگیر کے بعد اس کے نااہل جانشینوں کے عہد میں مسلمانوں پر سخت وقت آیا، تو وہ التتمش کی دینداری اور اولوالعزمی، بلبن کی فرکیخسروی، علاء الدین خلجی کے عہد کی اقتصادی خوشحالی اور رعیت پروری، محمد تغلق کی فیاضی اور عدل گستری، فیروز تغلق کی شریعت نوازی، بابر کا سپاہیانہ جوش و خروش اور آہنی عزم، ہمایوں کا استقلال و ہمت، شاہجہاں کی شان و شوکت اور عالمگیر کی نبرد آزمائی اور بیدار مغزی پھر سے دیکھنا چاہتے تھے جو میسر نہ ہوئی، اس کے بجائے انھوں نے جہاندار شاہ کی طوائف لال کنور کی رنگ رلیاں دیکھیں، جو اپنی تمام بدعنوانیوں کے ساتھ جہاندار شاہ کی جگہ حکومت کرنے لگی تھی، اور جس کو چاہتی اعزاز و منصب عطا کرتی، دربار اور حرم کی اس اخلاقی پستی کو دیکھ کر مسلمان خون کے آنسو روتے رہے، مسلمانوں میں اس وقت تک اجتماعی اور تنظیمی شعور پیدا نہیں ہوا تھا، ان کی قوت یا سلاطین تھے یا امراء، جب ان دونوں سے ان کو مدد نہ ملتی تو علماء کی طرف نظر اٹھاتے، اکبر کے زمانہ کی بے راہ روی کو جہانگیری عہد میں حضرت مجدد الف ثانی نے جس طرح

روکا تھا، اس سے لذت آشنا ہونے کے بعد ہر زمانے میں بادشاہ وقت کی کج روی کے سد باب کے لیے
علماء ہی کی طرف ان کی نظر اٹھتی تھی، لیکن عالمگیر کے بعد سلاطین کی بے راہ روی کو روکنے میں
علماء کی طرف سے کوئی صحیح رہنمائی نہیں ہوئی، اور جہاندار شاہ پر وہ مطلق اثر انداز نہ ہو سکے،
فرخ سیر کی وفات کے بعد اجیت سنگھ راٹھور اپنی لڑکی کو شاہی محل سے جودھپور لے جانے لگا تو
یہ راجپوت شاہزادی اپنا اسلامی لباس اتارتی گئی یعنی اسلام ترک کرکے ہندو بن کر باپ کے گھر گئی،
خافی خاں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں اس سے بڑی ہلچل پیدا ہوئی کہ ایک مسلمان عورت پھر ہندو ہو جائے،
یہ بات شریعت اسلام اور ناموس سلطنت کے خلاف سمجھی گئی، کیونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ
راجاؤں کی لڑکیاں مشرف بہ اسلام ہوکر بادشاہوں کی زوجیت میں رہنے کے بعد پھر ہندو بن کر
اپنے گھروں کو جائیں، علماء نے اس موقع پر احتجاج تو کیا لیکن وہ موثر نہ بن سکے اور اس عہد کے
بادشاہ گر قطب الملک سید عبد اللہ خاں نے راجپوت شاہزادی کو محل سے جانے کی اجازت دیدی
اور ایک کروڑ روپئے کا جہیزہ سامان بھی اس کے ساتھ واپس کردیا

محمد شاہ کے لڑکے احمد شاہ کے عہد میں تو حکومت کا نقشہ اور بھی بدل گیا، اس کی ماں اودھم بائی
ایک نو مسلم طوائف تھی، وہ اودھم بائی سے نواب قدسیہ صاحب زمانی حضرت قبلہ عالم ہوگئی اور
پنج لاکھ سوار کے منصب سے سرفراز کی گئی، اسی کی ڈیوڑھی میں دربار لگتا، اور سلطنت کے تمام اہم کام
انجام پاتے، اس کا بھائی مان خان ادنیٰ درجہ کا گویا اور نچنیا تھا لیکن شش ہزاری منصب دار بناکر
معتمد الدولہ بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، پھر محل کا ایک خواجہ سرا جاوید خاں وزارت عظمیٰ
پر فائز کیا گیا، اور اس کو نواب بہادر کے خطاب پانے کے ساتھ ہی مراتب، علم اور نقارہ
کے استعمال کی بھی اجازت دی گئی، اس پر علماء کی غیرت وحمیت ابھری تو احمد شاہ کی معزولی
کا فتویٰ صادر کیا، اور محمد شاہ محبوس کردیا گیا، پھر اس کی اور اس کی شوخ دیدہ ماں دونوں کی

آنکھیں نکلوادی گئیں، عام مسلمان اس سے آزردہ خاطر ہونے کے بجائے خوش ہوئے، لیکن مسلمانوں
کی حکومت کی گرتی ہوئی عمارت صرف فتوئی کے سہارے نہیں رک سکتی تھی، مسلمان سلاطین قطب مینار،
لال قلعہ اور تاج محل بناکر مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی کا رعب وجلال دکھا چکے تھے، اس لیے
ضرورت اس کی تھی کہ علماء وصلحاء اپنے دل بے تاب اور نگاہ مرد مومن سے مسلمانوں کے اخلاق وکردار
کے قطب مینار اور تاج محل بناکر ان کی تقدیر بدل دیتے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور جب اس کی کوشش
کی تو اس وقت بہت آخیر ہو چکی تھی جس وقت جانباز، سرفروش اور کفن بردوش علماء کے پیدا ہونے کی
ضرورت تھی، اس وقت ان کا فقدان ہو گیا تھا،

لائق سلاطین کے عہد میں لائق علماء

اور تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اچھے سلاطین ہی کے عہد میں اچھے
علماء بکثرت پیدا ہوتے رہے، اور نالائق سلاطین کے دور میں اچھے علماء پیدا نہ ہو سکے، ضیاء الدین برنی
نے لکھا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں اس قدر ارباب فضل وکمال جمع ہو گئے تھے کہ ربع مسکوں
میں اس کی کوئی مثال نہ تھی، اور اس کا دربار محمود وسنجر کا دربار معلوم ہوتا تھا، بلبن کے عہد میں مولانا
برہان الدین محمود بلخی، مولانا نجم الدین، عبد العزیز دمشقی، مولانا شیخ سراج الدین سنجری، مولانا
شرف الدین ولوالجی، قاضی رکن سامانوی، مولانا کمال الدین زاہد، مولانا شمس الدین خوارزمی،
مولانا فخر الدین ناقلہ، قاضی رفیع الدین گازرونی، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی ظہیر الدین،
شیخ الاسلام سید قطب الدین، مولانا سید منتخب الدین، مولانا سید معین الدین سامانہ کے علم و
فضل سے اس عہد میں فیوض وبرکات کا بڑا چشمہ بہتا رہا،

علاء الدین خلجی کا شمار دیندار اور متقی سلاطین میں نہیں کیا جاتا ہے، لیکن وہ ایک لائق اور
کامیاب حکمران ضرور تھا، اور اس کی حکومت میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ترقی ہوتی رہی،
اور اسی کے ساتھ اس کے عہد میں علماء بکثرت جمع ہو گئے تھے، ضیاء الدین برنی نے قاضی

فخرالدین ناقلہ، قاضی مشرف سربا ہی، مولانا نصیر الدین غنی، مولانا تاج الدین مقدم، مولانا رکن الدین سنامی، مولانا تاج کلاہی، مولانا ظہیرالدین بھکری، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا شہاب الدین ملتانی، وغیرہ جیسے چھیالیس ۴۶ علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ان میں سے ہر ایک کے علمی کمالات کا ذکر کیا جائے تو ایک ایک کتاب تیار ہو جائے' پہلے ذکر آچکا ہے کہ ان میں سے بعض علماء امام غزالی، امام رازی، امام ابویوسف اور امام محمد کے پایہ کے تھے، سلطان محمد تغلق کے دور میں مولانا ضیاء الدین بخشی، مولانا معین الدین عمرانی، مولانا عفیف الدین کاشانی، مولانا ناصرالدین واعظ ترمذی، مولانا عبدالعزیز اردبیلی، شیخ ابوبکر بن خلال وغیرہ جیسے علماء سے خواص و عوام فائدہ اٹھاتے رہے، یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ڈھائی سو فقہا اس کے دسترخوان پر موجود ہوتے تھے،

فیروز شاہی عہد میں مولانا صدرالدین یعقوب مظفر کرمانی، مولانا جلال الدین، مولانا علیم اند بھتی، مولانا خواجگی تھانیسری، قاضی عبدالمقتدر شریحی، مولانا عالم بن علا (مؤلف فتاویٰ تاتارخانیہ) مولانا شرف الدین محمد العطائی (صاحب فوائد فیروز شاہی) جیسے علماء موجود تھے، ان میں سے بعض علماء سے خود فیروز شاہ استفادہ کرتا رہا، سلطان سکندر لودی کے عہد میں مولانا شیخ سعد اللہ، مولانا شیخ رزق شتاقی، مولانا اللہ داد، مولانا شیخ عبدالوہاب بخاری، مولانا شاہ جلال تبریزی، مولانا شیخ عبداللہ تلمبنی، مولانا میاں طٰہٰ، مولانا میاں خواجگی، مولانا سید رفیع الدین صفوی، مولانا جلال الدین دوانی، مولانا شیخ حسام الدین المعروف بہ اجہر، مولانا میاں بھوہ، ممتاز علماء تھے، جو محراب و منبر اور مسند درس و تدریس کی زینت بنکر عوام و خواص کو اپنے علم و فضل سے سیراب کرتے رہے، عہد اکبری میں ابوالفضل نے شیخ مبارک ناگوری، شیخ نظام نارنولی، شیخ ادہن، امن اللہ، میاں وجیہ الدین، شیخ رکن الدین، شیخ عبدالعزیز، شیخ الہدیہ، شیخ

عبدالغفور کو خدیو نشاتین کہا ہے، میر فتح اللہ شیرازی، میر تقی، مولانا سعید ترکستانی، حافظ تاشکندی، مولانا شاہ محمد، مولانا علاء الدین، حکیم مصری، اور مولانا صادق کو دانندۂ معقول و منقول لکھا ہے' مولانا پیر محمد، مولانا عبدالباقی، مرزا مفلس، مولانا محمد، مولانا نورالدین ترخان کو شناسائے عقلی کلام بتلایا ہے، اور میاں حاتم، مولانا عبدالقادر، مخدوم الملک، میر عبداللطیف، میر نوراللہ، شیخ عبدالنبی وغیرہ کو "خوانای نقلی مقال" کہا ہے، ان کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حاجی ابراہیم محدث، شیخ جلال الدین تھانیسری، شیخ نظام الدین امیٹھوی، شیخ داؤدی جہنی وغیرہ کے فیوض و برکات سے عوام و خواص متمتع ہوتے رہے،

جہانگیر نے اپنے عہد میں میران صدر جہانی، مولانا مرزا شکراللہ شیرازی، مولانا نقیائے شوستری، مولانا مرزا محمد قاسم گیلانی کو ہر طرح نوازا، اور اس عہد میں اور جو دوسرے علماء تھے، ان کے نام ملا روزبہان شیرازی، اعمی اعمری، ملا باقر کشمیری، ملا باقر ٹھٹھی، ملا مقصود علی تبریزی، قاضی نوراللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبداللطیف سہارنپوری، ملا عبدالرحمٰن بوہرہ گجراتی، ملا حسن فراغی گجراتی، خواجہ عثمان حصاری اور ملا محمد جونپوری تھے،

شاہجہانی عہد میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا محمد فاضل بدخشانی، قاضی محمد اسلم ہروی، قاضی محمد سعید کرہ ہرودی، ملا میرک شیخ ہروی، ملا عبداللطیف سلطانپوری، میر محمد ہاشم گیلانی، ملا فرید دہلوی، ملا یوسف، ملا عبدالسلام لاہوری، مولانا محب علی، مولانا سید محمد قنوجی، ملا محمود جونپوری وغیرہ اسلام کی عزت و ناموس کے محافظ رہے،

عالمگیر نے مولانا عبداللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، علامی سعداللہ، ملا موہن بہاری، مولانا سید محمد قنوجی، ملا شیخ احمد معروف بہ ملا جیون، شیخ عبدالقوی، ملا شفیعائی دانشمند خاں جیسے علماء سے تعلیم پائی، پھر فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تدوین میں شیخ نظام برہانپوری

ملا محمد جمیل جونپوری، قاضی محمد حسین جونپوری، ملا حامد جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپامئوی، شیخ رضی الدین بھاگلپوری جیسے علماء اور فقہاء نے پوری اعانت کی، پھر اسی عہد میں ملا محمد یعقوب، شیخ سلیمان منیری، ملا قطب ہانسوی، ملا عبد اللہ سیالکوٹی، شیخ قطب برہانپوری، ملا عوض وجیہ، قاضی عبد الوہاب، مولانا سید محمد بیجاپوری، حاجی احمد سعید بہاری، سید علی اکبر سعد اللہ خانی، ملا محمد اکرم لاہوری، حافظ ابراہیم، ملا شرف الدین لاہوری، ملا عبد الباقی جونپوری، قاضی سید عنایت اللہ مونگیری، قاضی ملک محب اللہ بہاری، سید سعد اللہ سلونی وغیرہ اپنے علم و فضل، ذہانت و ذکاوت اور فطرت عالی کی وجہ سے عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے،

اچھے علماء کا فقدان

عالمگیر کے بعد نالائق حکمرانوں کی ایک طویل فہرست ہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ اس زوال اور ادبار کے زمانے میں شاہ ولی اللہ کے عہد شباب تک اچھے علماء اور صلحاء کا فقدان ہو گیا، شاہ ولی اللہ کی ولادت ۱۷۰۳ء میں ہوئی اور ۱۷۱۹ء میں وہ اپنے والد بزرگوار کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے، بارہ برس تک درس و تدریس دیتے رہے، پھر حجاز تشریف لے گئے اور وہاں سے علم حدیث کی تحصیل و تکمیل کرکے دو سال کے بعد واپس ہوئے، تو انھوں نے تجدید و اصلاح کا کام شروع کیا، اس اثناء میں جانشینی کی سات لڑائیوں سے تخت و تاج کی بنیاد ہل گئی تھی، ان لڑائیوں میں بڑے بڑے جانباز، آزمودہ کار اور لائق فوجی سردار مارے گئے اور جو مارے نہیں گئے وہ دربار سے منسلک ہونے کے بعد میدان جنگ کی کدورت دیوان عام اور دیوان خاص میں بیٹھ کر نکالتے رہے، جس سے دربار سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گیا، اور جہاندار شاہ سے بہادر شاہ ظفر تک دربار کی تاریخ نفاق پرور ریشہ دوانیوں اور ہلاکت خیز فتنہ انگیزیوں سے معمور ہے، اور جب حکومت شام غریباں بن کر رہ گئی تو مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور بڑھی، سکھوں نے پنجاب میں اپنا تسلط قائم کر لیا، جاٹوں اور انگریزوں نے بھی حکومت

کی بازی لگائی، اس طوائف الملوکی میں اچھے علماء کی پیداوار بھی بند ہو گئی، درس و تدریس کی مسند تو خالی نہیں ہوئی، محراب و منبر کی زینت بھی نہیں گئی، لیکن ان علماء سے مسلمانوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا، شاہ ولی اللہ اپنے عہد کے علماء کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے دکھ اور درد سے فرماتے ہیں،

"اے بدعقلو! جنھوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو اور صرف، نحو اور معانی میں غرق ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا، چاہیے کہ قرآن سیکھو..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی اور آپ کی سنت پر عمل کرو..... تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے، حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں جو علماء سے خالی ہیں، اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعار کو غلبہ حاصل نہیں ہے...... دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں..... کہ تمھارا کیا حال ہے، ہر بری بھلی بات، ہر رطب و یابس پر تمھارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے، نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دوگے"۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اسی طرح سلاطین کی زبوں حالی پر خون کے آنسو روتے ہیں اور وہ ایک خط میں گذشتہ زمانہ کو یاد کرکے لکھتے ہیں کہ بادشاہانِ اسلام کا وجود اللہ تعالیٰ کی ایک زبردست نعمت ہے، قدیم اسلامی بادشاہوں نے بڑی مدت میں بڑی جد و جہد کے بعد اس ولایت کو فتح کیا، دہلی کے علاوہ جو صاحب اقتدار بادشاہوں کا مستقر رہی ہے، ہر علاقہ میں علیحدہ علیحدہ فرمانروا تھے، گجرات، ٹھٹھہ، بنگالہ، برہانپور، برار، اورنگ آباد، حیدر آباد، بیجاپور، مالوہ میں صاحب فوج

اور صاحب خزانہ بادشاہ ہوتا تھا، ہر ایک بادشاہ نے اپنی اپنی مملکت میں مسجدیں تعمیر کرائیں مدرسے قائم کیے، عرب و عجم کے مسلمان اپنے اپنے وطنوں سے منتقل ہو کر ان علاقوں میں آگئے، اور یہاں اسلام کی ترویج و اشاعت کا سبب بنے، اس وقت تک ان لوگوں کی اولاد اسلام کے طور و طریقہ پر قائم ہے، لیکن آگے چل کر اپنے زمانے کے سلاطین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انکی ناعاقبت اندیشی، غفلت اور اختلاف فکر کی وجہ سے طوائف الملوکی شروع ہو گئی، مرہٹوں اور جاٹوں کو غلبہ حاصل ہو گیا، بادشاہوں کی نااہلی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ بیت المال کا صحیح انتظام نہیں کرتے اور خزانہ کی قلت کے باوجود ایسے لوگوں کو وظائف دیتے ہیں جو محنت نہیں کرتے لیکن وظایف پاکر خزانے پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، خزانے کو بھرنے کے لیے کاشتکاروں، بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری بھاری محصول لگایا جاتا ہے، پھر بھی فوج کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی، جاگیرداروں کی کثرت ہو گئی ہے، اور ان کے مسموم اثرات معاشرت میں پھیلے ہوئے ہیں،

امراء کی جو اخلاقی حالت بگڑ گئی تھی، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، شاہ ولی اللہؒ کو اس کا رنج تھا کہ وہ دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوب کر اپنا سارا وقار کھو چکے ہیں بلکہ ان کو اس کا بھی دکھ تھا کہ بنگال اور اودھ میں انھوں نے اپنی اپنی سلطنت قائم کر کے دہلی کی مرکزیت کو ختم کر دیا ہے۔

بگڑتی معاشرت اور جب اچھے سلاطین، اچھے امرا اور اچھے علما نہیں رہے جو حکومت اور معاشرت کو سنوارنے والے تھے، تو عام مسلمانوں کی بھی معاشرت بگڑی، شاہ ولی اللہؒ ان پر آنسو بہاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے اخلاق خراب ہو چکے ہیں، ان پر حرص و آز سوار ہو گیا ہے، ان پر شیطان نے قابو پا لیا ہے، انھوں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنا دیا ہے، روزی کمانے کے بجائے دوسروں کے سینوں کے بوجھ بنے ہوئے ہیں، دنیا کمانے اور دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کا مطلق خیال نہیں کرتے، انھوں نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لیے ہیں جن سے دین کی اصلی صورت بھی بگڑ گئی ہے اور انکی زندگی بھی انکے لیے تنگ ہو گئی ہے، مسلمانوں

میں جو پیشہ ور ہیں ان میں امانت کا جذبہ بالکل مفقود ہو گیا ہے، وہ فرضی معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہیں، مدار اور سالار کا حج کرتے ہیں، ان میں سے بعض لوگوں نے فال بازی، گنڈے اور ٹوٹکے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے، وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔

شاہ ولی اللہؒ کا احسان اس سقوط و تنزل کے زمانے میں شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے انحطاط کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد قلمی جہاد کیا اور قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ اور اس کے تشریحی فوائد لکھ کر عام مسلمانوں کے ذہن کو اس کی تعلیمات سے قریب تر کیا، اسی طرح حدیث کی اہم ترین کتاب موطا کی فارسی اور عربی میں مجتہدانہ شرحیں لکھیں، صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی اور مدارس میں فقہ و منطق کے بجائے حدیث کے درس و تدریس پر زور دیا جس کو ان کے تلامذہ نے تمام ملک میں پھیلایا، تقلیدی فقہ کی جگہ تحقیقی فقہ کی اہمیت بتا کر فقہی جمود کو توڑا، اور حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش کی، اسی طرح ازالۃ الخفا لکھ کر شیعوں اور سنیوں کا ذہن صاف کیا، تفہیمات میں اصلاح معاشرت اور اصلاح رسوم پر زور دیا، اور حجۃ اللہ البالغہ تو آج تک علماء کے لیے شمع ہدایت ہے اور بقول مولانا شبلی اس کی نکتہ سنجیوں کے آگے، غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے، اور انھوں نے اپنے والد بزرگوار کے مدرسۂ رحیمیہ میں درس دینا شروع کیا تو اس کے طلبہ یہاں کے اصلاحی نصاب کو سندھ سے بنگال تک سیکڑوں مدارس میں رواج دیتے رہے، جس سے اسلام کی ایک نئی لہر ہندوستان میں پھیلی، اس موقع پر اس کا اظہار غیر مناسب ہو گا کہ اس مدرسہ کے لیے ایک عالی شان مکان محمد شاہ رنگیلے نے عطا کیا تھا، موجودہ دور کے ایک بڑے عالم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس رنگیلے نے مسلمانوں کے ساتھ وہ رنگیں سلوک کیا کہ اگر مسلمان اس غریب کو اس خدمت کی بنیاد پر بخش دیں تو وہ اس کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے،

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے درد مند دل کی سیاسی پکار ان کے ان خطوط میں سنائی دیتی ہے جو انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے علاوہ نجیب الدولہ اور نظام الملک کو لکھے، ان امراء میں اسلامی حمیت اور غیرت باقی رہ گئی تھی،

احمد سے شاہ صاحب نے فائدہ اٹھانا چاہا، نجیب الدولہ کو وہ رئیس المجاہدین، امیر الغزات اور منبع الحسنات کے لقب سے یاد کرتے رہے، اور نجیب الدولہ کی تائید سے احمد شاہ ابدالی کو مدعو کیا، اس دعوت پر احمد شاہ ابدالی ۱۷۶۱ء میں ہندوستان آیا اور پانی پت کی مشہور تیسری لڑائی ہوئی، اس کا نتیجہ اتنا تو ضرور ہوا کہ مغل بادشاہوں کی حکومت کی مدت کچھ اور بڑھ گئی، لیکن ان کی بنیادی کمزوریوں میں کوئی مضبوطی پیدا نہ ہو سکی، کیونکہ ان میں انکے اسلاف کی طرح شاہین کا جگر اور عقابی قوت پرواز باقی نہ رہ گئی تھی، انکی تلوار صیقل زدہ اور برندہ ہونے کے بجائے کند ہو چکی تھی، اور ان میں لہو ترنگ کے بجائے صرف نااہلی کا جل ترنگ رہ گیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت اورنگزیب کے آخری زمانے میں ہوئی، اور بہادر شاہ اول سے لیکر شاہ عالم تک کا زمانہ دیکھا، ان میں جہاندار شاہ اور احمد شاہ کی زندگی تو رنگینی اور بدمستی میں گذری، عالمگیر ثانی ایک مذہبی حکمراں تھا، غیر مسلم مورخوں کا بیان ہے کہ وہ عالمگیر اول کا مقلد بن کر حکومت کرنا چاہتا تھا، اور اس نے اپنے وزیر عماد الملک کی مدد سے بہت سی بدعتوں کو روک کر مذہب کو بھی فروغ دینا چاہا، شاہ عالم میں بھی دینداری تھی، وہ تو خواجہ میر درد کی مجلس سماع میں ذوق شوق سے شریک ہوتا تھا، اکبر ثانی کے تعلقات حضرت شاہ ولی اللہؒ کے گھر والوں سے بہت اچھے تھے، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں جامع مسجد دہلی میں رسول اللہ صلعم کے کچھ تبرکات رکھے رہتے تھے، جن کو نکالتے وقت لوگ زور شور سے نعت پڑھتے تھے اور ان کو شاہی محل زیارت کے لیے لیجاتے تھے، ایک روز شاہ اسمٰعیلؒ مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے کہ یہ تبرکات نکالے گئے لیکن انھوں نے انکا احترام نہیں کیا، لوگوں کو ناگوار ہوا اور بادشاہ اکبر شاہ ثانی سے انکی شکایت کی، بادشاہ نے ان کو بلوا کر واقعہ دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا یہ تبرکات مصنوعی ہیں، انکی تعظیم ضروری نہیں، بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا یہ کیسے؟ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ اس کو تو آپ بھی مصنوعی سمجھتے ہیں، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ تبرکات آپ کی زیارت کے لیے آتے ہیں، آپ کبھی انکی زیارت کے لیے تشریف نہیں لیجاتے، یہ سنکر بادشاہ چپ ہو گیا، پھر شاہ صاحب نے کلام مجید اور بخاری لانے کو کہا، اور ان کو ہاتھ میں لیکر واپس کر دیا، اس کے بعد بادشاہ سے فرمایا

کلام اللہ اور کلام رسول دونوں بڑے تبرکات ہیں، یہ دونوں چیزیں آپکے سامنے آئیں لیکن آپنے کوئی تعظیم نہ کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تبرکات کی تعظیم ان کے شرف کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ محض ایک رسم پرستی ہے، یہ سنکر بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں سونے کے کڑے تھے، شاہ صاحب نے اس کو بھی حرام بتایا، بادشاہ نے فوراً اتار دیے، ایک شہزادہ بیٹھا ہوا تھا، اسکی داڑھی منڈی ہوئی تھی، اس کو داڑھی رکھنے کی تلقین کی اور اس نے ان کے حکم کی تعمیل کی،

بہادر شاہ ظفر میں بھی بڑی مذہبیت تھی، اسکی حمد و نعت میں جو کیفیت ہے اس سے اس کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے، وہ بادشاہ کے لباس میں ایک صوفی منش درویش تھا، اس کو مولانا فخر الدین سے شرف بیعت بھی حاصل تھا، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا، تصوف میں اس کو اس قدر انہماک ہو گیا تھا کہ سعدی کی گلستاں کی شرح صوفیانہ نقطۂ نظر سے خود لکھی، اور اشغال واذکار میں ایک کتاب سراج المعرفت لکھوائی،

لیکن کسی حکمراں کی مذہبیت اسی وقت موثر ہو سکتی ہے جب اس میں عبدیت، فاروقیت اور اسد اللہیت کا پرتو ہو، یہ درجہ تو بہت بلند ہے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں شاید ہی کسی کو حاصل رہا ہو اس لیے دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبیت کے ساتھ اگر بلبنیت، بابریت اور عالمگیریت بھی ہو تو وہ موثر ہو سکتی ہے، مغلوں کے آخری چند سلاطین مذہبی تو تھے، مگر ان میں مذہب کی اعلیٰ روح نہ تھی، اور تاریخ کو مڑ کر دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی اگرچہ سنگ دل اور بظاہر مذہب سے بیگانہ وشی کا الزام عائد کیا جاتا ہے، پھر بھی اس کا دور اس لحاظ سے غنیمت ہے کہ اس کے زمانہ میں دہلی قبۂ اسلام بن گئی تھی، اسی طرح بلانوش اور پیالہ کش جہانگیر کا عہد حکومت اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس دور میں حضرت مجدد الف ثانی کی کوششوں سے دین کا احیا ہوا،

اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مذہبیت سے ان کا ذاتی وقار تو کچھ ضرور قائم رہا، لیکن انکی نااہلیت کی وجہ سے ان کی حکومت سنبھل نہ سکی، اسی لیے اس زمانے میں علماء نے جو تحریک اٹھائی، اس میں

انھوں نے خود بھی ان بادشاہوں کو نظر انداز کر دیا۔

علما کی دست گیری

اور یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ جب حکمران وقت ان کے لیے بیکار ہو گئے، تو علما نے آگے بڑھ کر ان کی دست گیری کی، شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصانیف سے جو ذہنی اور فکری انقلاب پیدا کیا، اس کو ان کی اولادوں اور شاگردوں نے اپنی غیر معمولی سرگرمیوں سے برقرار رکھا،

شاہ عبدالعزیزؒ

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے تو اپنے زمانہ میں یہ فتویٰ دیدیا کہ ہندوستان کے جس قدر حصے غیر مسلم طاقتوں کے قبضے میں جا چکے ہیں، ان میں برائے نام سلطان کا دخل مانا بھی جاتا ہو تو وہ سب کے سب دار الحرب ہیں،

شاہ اسمٰعیل شہید

اور پھر حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عملی سرگرمیوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ اب اس کا وقت نہیں رہا کہ علماء ارباب رخصت بن کر مدرسوں میں درس دیتے رہیں اور محراب و منبر کی زینت بن کر صحیح عقائد کے اعلان پر قناعت کرلیں، بلکہ اس کا وقت آگیا ہے کہ ارباب عزیمت بن کر اسلام کی عزت و ناموس کی پاسبانی کریں، مسلمان خواص و عوام دونوں کی بگڑی ہوئی معاشرت کو سنواریں، اور کانٹوں کی راہ پر چل کر سر بکف اور کفن بردوش ہو جائیں۔

انھوں نے تجدید اصلاح کی خاطر پہلے بدعتوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی، مسجدوں، عرسوں اور مجلسوں میں جہاں مسلمان جمع ہو جاتے، وعظ کہنے لگتے، اور ان کو توحید و تقویٰ کی طرف پکار پکار کر بلاتے، معصیت کے اڈوں پر بھی پہنچ کر اللہ کا پیام سناتے اور معصیت کی زندگی چھوڑ کر صالح زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے۔

انھوں نے تقویۃ الایمان لکھ کر یہ بتایا کہ وہی زندگی تہذیب اور معاشرت اسلامی ہے جو قرآن اور سنت کے مطابق ہو، اس کے علاوہ کوئی زندگی یا تہذیب یا معاشرت خواہ

کیسے ہی شاندار اور دل آویز ہو، اسلامی نہیں کہی جا سکتی، اس کتاب کے متعلق موجودہ دور کے ایک بڑے عالم کی رائے ہے کہ اگر یہ کتاب پانچ سو سال پہلے لکھی جاتی تو ہندوستانی مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتے لیکن پھر بھی اس کتاب نے مسلمانوں میں ایک بڑا ذہنی انقلاب پیدا کیا۔

حضرت احمد شہید بریلویؒ

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ حضرت احمد شہید بریلویؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی، جو ان سے عمر میں آٹھ سال چھوٹے تھے، اور ان کے چچا شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد اور مرید تھے، ان کی ذات میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہؒ کے فضل و کمال اور مجاہدہ وحال کے دوآتشہ سے ایک سہ آتشہ تیار ہوا تھا، دونوں کی کوششوں سے تجدید دین کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی جس کو ہندوستان میں سب سے پہلی اسلامی تحریک سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور دونوں نے مل کر مسلمانوں کی ایک ایسی مخلص جماعت پیدا کی جو خدا اور نبی کی وفادار اور حق کے نشہ میں سرشار ہو کر جہاد کے لیے آمادہ ہو گئی لیکن ترائین، کنواہا اور پانی پت کے فاتحوں اور ارکان بلخ اور قندھار پر پرچم لہرانے والوں کے جانشینوں سے اس کو کوئی مدد نہیں ملی کیونکہ وہ مدد دینے کی لائق ہی نہیں رہ گئے تھے، اس جماعت کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی، اور بالاکوٹ میں حضرت اسمٰعیلؒ اور حضرت احمد شہیدؒ بریلوی دونوں شہید ہوئے، انکی ناکامی کے اسباب پر اب تک تحقیقات جاری ہیں لیکن جس طرح کربلا کے بعد اسلام زندہ ہوا، اسی طرح اس تحریک کے کربلا کے بعد ہندوستان میں اسلام پھر سے زندہ ہوا، کیونکہ ان دونوں بزرگوں کے پیروؤں نے ان کی تعلیمات کو پنجاب سے لیکر بنگال کی سرحد تک جاری رکھا، اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمانوں کی سلطنت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تو نہ بچا سکے، لیکن انھوں نے دین و مذہب اور ایمان و یقین کی ایک نئی روح پھونک کر ہندوستان میں اسلام کو بچا لیا جس کو مسلمان اپنی زندگی کا اساس بنا کر انگریزوں کے دور حکومت

میں ہر قسم کے حوادث کا مقابلہ کرتے رہے، اور آج ہندوستان میں جہاں بھی قال اللہ اور قال رسول اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ ولی اللّٰہی خیالات سے متاثر ہونے والے ہی بزرگوں کی صدائے بازگشت ہے، علماء کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے،

البتہ اخلاص نیت کی بناء پر جس طرح یہ کہا گیا ہے کہ تقویت الایمان پانچسو برس پہلے لکھی گئی ہوتی تو ہندوستان کا مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتا، اسی طرح ایک بہت بڑا گروہ زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے، کہ عالمگیر کے بعد ہی کوئی شہید احمد بریلوی یا اسمٰعیل شہید پیدا ہو گیا ہوتا تو آج مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور یہ مسلمانوں کی بدقسمتی رہی کہ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ جیسے عالی دماغ علماء پیدا ہوئے تو ان کے زمانے میں تخت پر عالمگیر جیسا بادشاہ نہیں رہا، یا عالمگیر جیسے حکمراں کو حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، حضرت اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت احمد شہید بریلویؒ جیسے مجاہد، مفکر، سر بکف اور کفن بدوش علماء نہیں ملے،

اسی لیے مسلمانوں کے عروج و کمال اور سقوط و زوال کی تاریخ ان کے سلاطین ہی سے وابستہ ہو کر رہ گئی، جب تک تخت و تاج کو ہوشمند اور بیدار مغز حکمراں ملتے رہے، مسلمانوں کو اپنی سیاسی اور تمدنی زندگی پر ناز رہا، اور جیسے ہی حکمراں طبقہ کی ہوش مندی اور عالی دماغی جاتی رہی، مسلمان اپنی شوکت و حشمت سے محروم ہو گئے، عام مسلمانوں نے سلاطین اور علماء دونوں کے سامنے جھکنے میں تامل نہیں کیا، کیونکہ دونوں اپنے کو اسلام کا محافظ اور پاسبان کہتے رہے، لیکن دونوں کی ہم آہنگی اور تعاون کی تاریخ زیادہ روشن نہیں، ایک دوسرے سے مشکوک اور آزردہ خاطر ہونے کے بجائے دونوں انجام بینی، مآل اندیشی اور مصلحت کوشی سے کام لے کر اپنی عملی اور ایمانی قوتوں کو ایک دوسرے کا سہارا بناتی رہتیں، تو مسلمانوں کی تاریخ کا رخ کچھ اور ہوتا۔

(باقی)

شاہ محمد غوث گوالیاریؒ

ابتدا ۹۰۷ھ / ۱۵۰۱ء - انتہا ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء

از

جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب

نسب | شاہ محمد غوث گوالیاریؒ (متوفی ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء) کا سلسلۂ نسب خواجہ فریدالدین عطار (متوفی ۶۲۷ھ / ۱۲۳۰ء)[1] سے ملتا ہے، موصوف اپنی مشہور تصنیف جواہر خمسہ (۹۲۹ھ / ۱۵۲۲ء) کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

" نقال الفقیر الراجی الی اللہ ملک القدوس السلام المومن المہیمن العزیز الجبار محمد بن خطیرالدین بن عبد اللطیف بن معین الدین قتال بن خطیرالدین بن بایزید بن خواجہ فریدالدین عطار ...."[2]

یوسف الیاد سرکیس نے یہ غلطی کی ہے اور تین واسطوں کو چھوڑ کر لکھا ہے:-

" محمد بن خطیرالدین بن بایزید ابن فریدالدین العطار۔"[3]

تھامس ولیم بیل (T. W. Beale) نے لکھا ہے کہ آپ کا شجرۂ نسب ساتویں پشت

---

[1] Levy = Persian Literature, London, 1948. P-48

[2] شاہ محمد غوث = جواہر خمسہ (اردو) ترجمہ مرزا محمد بیگ مطبوعہ دہلی، ۱۳۲۵ھ

[3] یوسف الیاد سرکیس = المطبوعات العربیۃ والمعربۃ، مطبوعہ مصر، ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء

میں ہر قسم کے حوادث کا مقابلہ کرتے رہے، اور آج ہندوستان میں جہاں بھی قال اللہ و قال رسول اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ ولی اللّٰہی خیالات سے متاثر ہونے والے ہی بزرگوں کی صدائے بازگشت ہے، علماء کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے،

البتہ اخلاص نیت کی بنا پر جس طرح یہ کہا گیا ہے کہ تقویت الایمان پانچسو برس پہلے لکھی گئی ہوتی تو ہندوستان کا مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتا، اسی طرح ایک بہت بڑا گروہ زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ عالمگیر کے بعد ہی کوئی شہید احمد بریلوی یا اسمٰعیل شہید پیدا ہو گیا ہوتا تو آج مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور یہ مسلمانوں کی بدقسمتی رہی کہ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ جیسے عالی دماغ علماء پیدا ہوئے تو ان کے زمانے میں تخت پر عالمگیر جیسا بادشاہ نہیں رہا، یا عالمگیر جیسے حکمراں کو حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، حضرت اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت احمد شہید بریلویؒ جیسے مجاہد، مفکر، سر بکف اور کفن بردوش علماء نہیں ملے، اسی لیے مسلمانوں کے عروج و کمال اور سقوط و زوال کی تاریخ ان کے سلاطین ہی سے وابستہ ہو کر رہ گئی، جب تک تخت و تاج کو ہوشمند اور بیدار مغز حکمراں ملتے رہے، مسلمانوں کو اپنی سیاسی اور تمدنی زندگی پر ناز رہا، اور جیسے ہی حکمراں طبقہ کی ہوشمندی اور عالی دماغی جاتی رہی، مسلمان اپنی شوکت و حشمت سے محروم ہو گئے، عام مسلمانوں نے سلاطین اور علماء دونوں کے سامنے جھکنے میں تامل نہیں کیا، کیونکہ دونوں اپنے کو اسلام کا محافظ اور پاسبان کہتے رہے، لیکن دونوں کی ہم آہنگی اور تعاون کی تاریخ زیادہ روشن نہیں، ایک دوسرے سے مشکوک اور آزردہ خاطر ہونے کے بجائے دونوں انجام بینی، مآل اندیشی اور مصلحت کوشی سے کام لے کر اپنی عملی اور ایمانی قوتوں کو ایک دوسرے کا سہارا بناتی رہتیں، تو مسلمانوں کی تاریخ کا رخ کچھ اور ہوتا۔

(باقی)

شاہ محمد غوث گوالیاریؒ

۹۰۷ھ / ۱۵۰۱ء — ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء

از

جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب

نسب شاہ محمد غوث گوالیاریؒ (متوفی ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء) کا سلسلۂ نسب خواجہ فریدالدین عطار (متوفی ۶۲۸ھ / ۱۲۳۰ء)؟ سے ملتا ہے[1]، موصوف اپنی مشہور تصنیف جواہر خمسہ (۹۲۹ھ / ۱۵۲۲ء) کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"فقال الفقیر الراجی الی اللہ ملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار محمد بن خطیرالدین بن عبداللطیف بن معین الدین قتال بن خطیرالدین بن بایزید بن خواجہ فریدالدین عطار ......"[2]

یوسف الیان سرکیس نے یہ غلطی کی ہے اور تین واسطوں کو چھوڑ کر لکھا ہے:-

"محمد بن خطیرالدین بن بایزید ابن فریدالدین العطار۔"[3]

تھامس ولیم بیل (T. W. Beale) نے لکھا ہے کہ آپ کا شجرۂ نسب ساتویں پشت

---

[1] Levy = Persian Literature, London, 1948. P-48

[2] شاہ محمد غوث: جواہر خمسہ (اردو) ترجمہ مرزا محمد بیگ مطبوعہ دہلی، ۱۳۲۵ھ

[3] یوسف الیان سرکیس: المطبوعات العربیہ والمعربہ، مطبوعہ مصر، ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء

میں خواجہ فرید الدین عطار سے ملتا ہے۔[1] مگر اس نے بھی یہ غلطی کی ہے کہ شاہ محمد غوث کے دادا کا نام معین الدین قتال لکھا ہے جو ان کے پردادا کا نام ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ والد کا نام قیام الدین لکھا ہے، حالانکہ خطیر الدین تھا۔

مقالہ نگار دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے قول کے مطابق شاہ محمد غوثؒ (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کے پردادا معین الدین قتال سب سے پہلے ہندوستان تشریف لائے، اور جونپور میں انتقال فرمایا۔[2] مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی لکھا ہے:-

"و جدّ مرحوم وے از سادات عظام نیشاپور بود و بعد ازاں در ہندوستان تشریف آوردہ قیام پذیر گشت۔"[3]

صاحب مناقب غوثیہ (۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء) نے بھی لکھا ہے:-

"آپ کے جد امجد (پردادا) سید معین الدین قتال جونپور میں مدفون ہیں اور والد ماجد سید خطیر الدین کھیڑہ میں مدفون ہیں۔ یہ غازیپور کے علاقے میں ہے۔ آپ کا قیام بھی کھیڑہ میں تھا۔"[4]

ولادت شاہ محمد غوثؒ نے اپنی تصنیف اوراد غوثیہ (۹۴۹ھ) میں اپنی تاریخ ولادت، رجب المرجب روز جمعہ وقت نماز پیشیں ۹۰۷ھ تحریر فرمائی ہے لیکن مقالہ نگار دائرۃ المعارف الاسلامیہ نے خود شاہ محمد غوثؒ کے حوالے سے تاریخ ولادت ۹۰۶ھ تحریر کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:-

---

[1] T. W. Beale – Oriental Biographical Dictionary Calcutta, 1881. P– 166.
[2] دائرۃ المعارف الاسلامیہ (ہالینڈ) ایڈیشن ۱۹۱۳ء ص ۸۱-۱۰۰
[3] مفتی غلام سرور لاہوری = خزینۃ الاصفیا، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۳ء
[4] شاہ فضل اللہ شطاری = مناقب غوثیہ (اردو) مترجمہ ظہیر الحق احمد آبادی، مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۳ء۔

"اپنے بیان کے مطابق محمد غوثؒ کی ولادت ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) میں ہوئی۔" (دائرۃ المعارف الاسلامیہ) معلوم نہیں اس کا ماخذ کیا ہے، ورنہ اوراد غوثیہ (۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء) میں خود شاہ محمد غوث نے تحریر فرمایا ہے:-

"و تولد این فقیر ہفتم ماہ رجب روز جمعہ وقت نماز پیشین سنہ سبع و تسعمائۃ شدہ بود۔"[1]

حالات زندگی شاہ محمد غوثؒ نے اوراد غوثیہ میں سات سال کی عمر سے ۴۳ سال کی عمر تک کے حالات زندگی نہایت اختصار سے تحریر فرمائے ہیں، یہاں موصوف کا بیان نقل کیا جاتا ہے، اس میں سنین کا تعین، سنہ ولادت ۹۰۶ھ کی روشنی میں راقم نے کیا ہے:-

"ایں درویش ہفت سالہ بود (۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء) کہ دریں راہ آمد و نُہ سالہ بود (۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء) کہ معرفت حاصل شد۔ و پانزدہ سالہ بود (۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء) کہ رہ نمونی می کرد۔ و بیست و دو سالہ بود (۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء) کہ معراج شد و بیست و پنج سالہ بود (۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء) کہ طالبان را ہم چوں خود می کرد۔ و سی و سہ سالہ بود (۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء) کہ مرجع خاص و عام شد، صورت اقتدائیت و امامت رو نمود۔ چہل سالہ بود (۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء)، کہ از بادشاہان تفاوت پیدا شد، سفر اختیار کرد، در ولایت گجرات آمد۔ ایں اوراد در قلعہ چاپانیر بہ قلم آمد ...... در وقت انشاء مذکور عمر ایں درویش چہل و سہ سالہ بود (۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء)۔ و تولد ایں فقیر ہفتم ماہ رجب روز جمعہ وقت نماز پیشین سنہ سبع و تسعمائۃ شدہ بود و املائے مذکور در ماہ جمادی الاول سنہ تسع و اربعین و تسعمائۃ است۔"[2]

اس بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روحانی زندگی کا آغاز سات برس کی عمر میں (۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء) ہوا تھا لیکن صاحب مناقب غوثیہ (۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء) شاہ فضل اللہ شطاری نے لکھا ہے:

---

[1] شاہ محمد غوث = اوراد غوثیہ (فارسی) مطبوعہ مطبع صبغۃ اللّٰہی ۱۳۱۳ھ ص ۴۵ [2] ایضاً ص ۴۵

"جب بارہ سال کی عمر ہوئی تو طلب خدا میں سرگرداں ہوتے ہوئے جونپور تشریف لائے اور قاضی عبد... جہاں کے مکان پر قیام کیا، قیام کے دوران علمی تحصیل میں مصروف رہے، کافیہ وغیرہ تک عبور حاصل کرلیا، پھر اسی کو کافی سمجھ کر علم باطنی کی تلاش میں مصروف ہوگئے"۔[1] (ملخصاً)

روحانی زندگی کے آغاز کے سلسلے میں شاہ محمد غوث کا بیان ہی مستند سمجھا جائے گا، محمد غوثی کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر سات سال کی تھی۔[2]

شاہ فضل اللہ شطاری کے مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد غوث کی عربی تعلیم صرف کافیہ تک محدود تھی، مگر آپ کی متعدد تصانیف کی داخلی شہادت ہے کہ آپ کو علوم منقول میں کافی دسترس حاصل تھی، اور آپ کے خلفاء میں شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء) جیسے جلیل القدر اور متبحر علماء بھی شامل تھے، جس سے بھی آپ کی علمیت اور روحانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

طلب شوق

بقول صاحب مناقب غوثیہ، شاہ محمد غوث روزانہ اپنے پردادا سید معین الدین قتال کے مزار مبارک پر جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ غلبۂ شوق میں رات وہیں بسر کی، صبح کو بشارت ہوئی:-

"!! محمد! جاؤ صدیقی کی کفش برداری کرو اور ان کی خدمت بجا لاؤ کہ جو انواع و اقسام کے انعام جمع ہوچکے ہیں ان کا ظہور ہو"۔[3]

یہ بشارت لیکر جونپور سے گور پہنچے، اور حضرت شاہ ابو الفتح ہدایت اللہ سرمست (متوفی ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء) کی خدمت میں حاضر اور آپ کی صحبت سے مستفیض ہوئے، یہاں سے فیضیاب ہوکر کالنجر گئے، یہاں سے پھرتے پھراتے ایک دوسرے شہر میں پہنچے، اس شہر کے قریب ایک پہاڑ تھا جس پر ایک بزرگ رہا کرتے تھے، ان کے حالات سن کر شاہ محمد غوث کو ان سے ملاقات

[1] مناقب غوثیہ (اردو) مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء [2] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) مترجمہ فضل احمد مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۲۲ [3] مناقب غوثیہ (اردو) ص ۷

کا اشتیاق پیدا ہوا اور پہاڑ پر جاکر ان کی زیارت کی، ان بزرگ نے شاہ صاحب کو اپنے قریب بٹھایا اور فرمایا:

"خوش آمدید! خوب آئے اور بروقت آئے کہ میں بھی آپکے انتظار میں تھا کیونکہ مجھے خدائے برتر نے مقام غوث بخشا ہے اور اب میری دنیاوی عمر تمام ہوچکی ہے، حکم ہوا تھا کہ فلاں وقت اس شکل و شمائل کا ایک مرد آنے والا ہے، تم ان کو یہ درجہ غوثیت سونپ کر دنیا سے عالم بقا کی طرف آجاؤ، بحمدہ کہ حق تعالیٰ نے آپ کو پہنچایا، اب آپ اس وقت تشریف لیجائیے"۔[1]

ان سے مل کر شاہ محمد غوث پہاڑ سے اتر آئے، دوسرے روز جب پہنچے تو دیکھا کہ درویش بزرگ نماز سے فارغ ہوکر سجدہ میں گئے اور جان، جاں آفریں کے سپرد کردی اور حق، حقدار کو سونپ دیا۔

یہ بیان شاہ فضل اللہ شطاری کی تصنیف مناقب غوثیہ سے نقل کیا گیا ہے، یہ کتاب شاہ محمد غوث کی حیات ہی میں ان کے انتقال سے ۲۹ سال قبل تصنیف ہوچکی تھی، اس لیے اس کے بیانات سب سے زیادہ مستند ہیں،

اسی قسم کا ایک واقعہ محمد غوثی نے گلزار ابرار (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء) میں شیخ پھول (متوفی ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء) برادر بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کی زبانی نقل کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:-

"شیخ فضل اللہ بنگالی، میرے بھائی شیخ محمد اور فقیر پھول ہم تین آدمی چنار کے کوہستان میں ریاضت کے ارادہ سے آئے تھے، وہاں کے باشندوں نے بیان کیا کہ دو سو برس ہوئے ہم اپنے بزرگوں سے مسلسل سنتے چلے آتے ہیں، اس غار میں ایک درویش گوشہ گزیں ہیں اور مشغول بخدا ہیں، ہم میں سے کسی کو اندر جانے کی طاقت نہیں جو ان کے ہونے یا نہ ہونے کی خبر لائے، یہ سن کر ہم تینوں آدمیوں نے تلاش کے واسطے اس غار میں

[1] مناقب غوثیہ (اردو) ص ۸

قدم رکھا، جب ہم دو منزل کے برابر راہ چل لیے تو وہاں پر ہم نے ایک پیر کو مراقب دیکھا کہ اس نے اپنی نورانی پیشانی سجادہ پر رکھ چھوڑی ہے۔ وہ پیر ہمارے پہنچنے سے آگاہ ہوا، اٹھا اور نہایت ترحم کے ساتھ آگے بڑھا، بہت کچھ مرحبا اور التفات کے ساتھ پیش آیا۔ اور ہر ایک کو ایک جداگانہ خطاب سے سرفراز کیا، مجھکو جہانگیر بھائی کو غوث اور فضل اللہ کو اہل اللہ کہا، اسرار وحقایق اپنی تقریر میں ظاہر کرکے آنے والوں کو آگاہ کیا، اور اصل حقیقت پر اطلاع بخشی، اس کے بعد جلدی سے خلوت میں گھس گیا، تھوڑی دیر بعد ہم لوگوں نے واپس آنے کی اجازت مانگی، جواب کہاں سے آتا۔ وہ تو واصل حق ہو چکا تھا، اس سفر کا سامان اس غار میں مہیا کر رکھا تھا، ہم نے اس سامان کو کام میں لاکر نعش سپردِ خاک کی۔"[1]

اس درویش کو سپرد خاک کرکے شاہ محمد غوث دوبارہ گور تشریف لائے، اور پھر شاہ ابو الفتح ہدایت اللہ سرمست کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہونے کی خواہش ظاہر کی، آپ نے فرمایا:-

"تمہاری ارادت حضرت حاجی حمید الدین کے دست خاص پر مقرر ہے۔ اب سارنپور جاؤ۔"[2]

اس حکم پر شاہ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) سارنپور پہنچے اور حاجی حمید الدین حضور (متوفی ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء) کی شرفِ پابوسی سے مشرف ہوئے۔

حاجی حمید الدین حضور، مولانا ظہیر الدین غزنوی کے فرزند رشید ہیں، آپ کی ولادت ۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء میں ہوئی، بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، سنِ شعور کو پہنچے تو طلب علم کی فکر دامن گیر ہوئی، اور گوالیار آکر قیام فرمایا، خدا شناسی کی لو لگی تو توفیق الٰہی سے شیخ محمد علا المعروف بہ قاضن کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے، شیخ طریقت کے انتقال کے بعد ان کے فرزند رشید حضرت ابو الفتح ہدایت اللہ سرمست (متوفی ما بعد ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء) کی صحبت میں مقاماتِ سلوک طے کیے۔

---

[1] ترجمہ گلزار ابرار (اردو)، ص ۵، ۱۳۲۴ھ مناقب غوثیہ اردو ص ۸

چالیس برس کی عمر میں تقریباً ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں سفر حجاز اختیار کیا، اور شاہ ابو الفتح نے مختلف سلاسل طریقت کا خرقہ عطا فرما کر رخصت کیا،

مکہ معظمہ میں پہنچے اور حج وعمرہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور وہاں چالیس سال تک جاروب کشی کی (تقریباً ۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء تک)

کافی ضعیف ہو چکے تھے، اولاد تھی نہیں، یہ فکر دامن گیر ہوا کہ روحانی دولت کا ورثہ کس کے سپرد کیا جائے گا، ادھر خیال آتا تھا ادھر خواب میں دو بچوں کی مثالی صورتیں دکھائی گئیں اور یہ بشارت دی گئی،

"یہ فرشتہ نما صورتیں جن اطفال کی ہیں وہ تمہارے باطنی خزانوں کی خزانچی گری کے واسطے ازل سے نامزد ہیں اور ان کا دیدار ہند میں تم کو فکر تلاش سے رہائی بخشے گا،"[1]

اس کے بعد آپ حجاز سے ہندوستان روانہ ہو گئے اور گوالیار پہنچے، یہاں شیخ پھول (متوفی ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء) اور شاہ محمد غوث (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کو دیکھا تو وہ دونوں صورتیں جو عالم مثال میں دکھائی گئی تھیں، یاد آگئیں، شکر بجا لائے، اس وقت شاہ محمد غوث کی عمر ۰ سال کی تھی،

بیعت وریاضت

حاجی حمید الدین حضور نے دونوں بھائیوں کی تعلیم وتلقین کی اور شیخ پھول کو اپنے ہمراہ لے کر صوبہ بہار کی طرف روانہ ہو گئے اور شیخ محمد غوث کو کوہستان چنار میں ریاضت کے لیے چھوڑ دیا، پھر چند دنوں بعد شیخ پھول کو بھی حصولِ فیض کے لیے شیخ محمد غوث کے پاس بھیج دیا، شاہ محمد غوث تیرہ سال چند مہینے عبادت وریاضت میں مشغول رہے، اس کے بعد جب حاجی حمید الدین حضور واپس ہوئے تو مرید کو بامراد پایا، شاہ محمد غوث نے اس عرصہ میں جواہر خمسہ (۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء) تصنیف کی تھی، وہ شیخ کے سامنے پیش کی، وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

---

[1] محمد غوثی، گلزار ابرار (اردو) مترجمہ فضل احمد مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۲۲

"اسرار و اعمال کے جواہرات جو میرے تصرف اور قوت میں تھے، وہ قبل ازیں تم کو حوالہ کر چکا ہوں اور میں نے اپنے پاس نام کے سوا کچھ نہیں رکھا تھا، اب نام کو بھی کتاب کے صلے میں جو مظہر افعال ہے، تمہارے اوپر تصدق کرتا ہوں[1]۔"

چنانچہ بقول شاہ فضل اللہ شطاری اسی دن سے حضرت حمید الدین حضور کا اسم گرامی شیخ ظہور الحق والدین ہوگیا اور شاہ محمد غوث کا اسم گرامی حمید الدین عرف محمد غوث ہوگیا، اسی لیے ہرمن ایتھے (Hermann Ethe) نے شیخ حمید الدین حضور کو شیخ ظہور الدین حاجی حضور لکھا ہے[2]،

شاہ محمد غوث نے جواہر خمسہ کے دیباچے میں اپنی طلب سعی، شیخ کی خدمت میں حاضری کوہستان چنار میں ریاضت و عبادت اور شیخ کی نوازش و عنایت کا ذکر ہے، فرماتے ہیں:۔

"ابتدائے حال میں جب کہ مجھ کو کمال درجہ عشق و محبت کا دلولہ تھا، تو میں بموجب حکم وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا کے نہایت کوشش و محنت کرتا تھا، لیکن اپنی ہمت کی انتہا کو نہ پہنچتا تھا، یہاں تک کہ بمقتضائے ان سعید سوی جو کچھ کہ واقعہ اول میں میں نے دیکھا تھا، مجھ پر کھلا کہ موافق مضمون اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ کے بارگاہ حضرت سلطان الموحدین شیخ ظہور حاجی حضور متع اللہ بطول بقائہٗ میں حاضر ہوتا کہ اپنے مقصد کو پہنچے، اور مطلب حاصل ہو، چنانچہ میں نے قصد کیا اور طلب مقصود میں مستعد ہوا، یہاں تک کہ آنحضرت کے سایہ عرش پایہ سے مشرف ہوا، بعد ملاقات کے آپ نے فرمایا کہ خواجہ احمد کہاں ہیں؟ جب خواجہ احمد حاضر ہوئے تو ارشاد کیا کہ "حق سبحانہ وتعالیٰ

[1] محمد غوثی: گلزار ابرار اردو ترجمہ فضل احمد مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۲۳ ـ ۲۲
[2] Hermann Ethe = Catalogue of The Persian Manuscripts in The Library of The India office, Vol I P. 1042—3, Oxford, 1903.

نے جو مجھ سے وعدہ فرزند کا فرمایا تھا، وہ یہی ہے، جس نے توفیق اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ کی پائی ہے۔ اور آپ کا سن شریف زیادہ تھا، چنانچہ مشہور ہے، بعد ایک مدت مدید کے شرف خدمت سے میں مشرف ہوا اور آپ نے جواہر علم باطنی کے دریائے وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ سے اور زر واہر افضال ظاہری بوستان سرائے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ کل ذی فضل فضلہ سے اس فقیر کو عطا کیے۔ اس کے بعد کوہستان چنار میں جا کے تیرہ برس اور کئی مہینہ خلوت میں رہا اور جو کچھ حضرت نے ارشاد کیا تھا، اس پر عمل کیا، اور حالات گذشتہ لکھ لکھ کے جمع کیے، چند برس کے بعد آنحضرت نے مثل ہما کے اپنا سایہ بلند پایہ اس فقیر کے سر پر ڈالا اور اس نے جملہ حالات عرض کیے، آپ خوش ہوئے اور دعا فرمائی اور اپنا پیراہن خاص مجھ کو عطا کیا جس سے میں نے بشارت القاہ علی وجھہ فارتد بصیرا کی پائی اور یہ کتاب جس کا نام جواہر خمسہ ہے، حضرت ممدوح کے دست مبارک میں دی، جب یہ پانچوں جوہر نظر کیمیا اثر حضرت سے مشرف ہوئے، فرمایا کہ "تو نے اپنا کام خوب انجام دیا، اور خلق اللہ کو ہدایت وافر کی، یہ ہمیشہ اولیاء اللہ کے لیے حجت ہوگی اور کوئی ولی ایسا نہ ہوگا کہ ان بھیدوں سے خبردار نہ ہو۔ اس وقت اس درویش کی عمر بائیس برس کی تھی[1]۔"

یہ ترجمہ جواہر خمسہ مترجمہ محمد عبد الحکیم مطبوعہ فخر المطابع لکھنؤ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء ص ۵ سے نقل کیا گیا ہے۔ بقول مترجم اس نسخہ کی اصل کا ایک فارسی قلمی نسخہ تھا، جو سید شاہ رجب علی نے لکھا تھا، اور ان کا نسخہ حضرت میر سید محمود محقق الاکبر کنتوری نیشاپوری (م۔ ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء) سے نقل کیا گیا تھا۔ جواہر خمسہ کا ایک اور مستند ترجمہ مرزا احمد بیگ دہلوی نے کیا تھا جو ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں مطبع مجتبائی دہلی

[1] جواہر خمسہ (اردو) مترجمہ محمد عبد الحکیم، مطبوعہ لکھنؤ،

میں طبع ہوا تھا، اس ترجمہ میں اصل فارسی دیباچہ بھی نقل کر دیا گیا ہے، جو مذکورہ بالا ترجمے کے بالکل مطابق ہے۔ یہ ترجمہ جواہر خمسہ کے ایک قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا، جو ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء یا ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء کے لگ بھگ لکھا گیا تھا،

گلزار ابرار (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء) کا جو مطبوعہ اردو نسخہ ہمارے سامنے ہے، اس میں محمد غوثیؒ نے جواہر خمسہ کا جو دیباچہ نقل کیا ہے اس کا اسلوب قدرے مختلف ہے، مگر حقایق قریب قریب ایک ہی ہیں، اور چند باتوں میں توضیح سے کام لیا گیا ہے، مثلاً

(۱) حاجی حمید الدین حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے شرف بیعت سے مشرف کیا، (۲) تیرہ سال اور چند ماہ کے لیے کوہستان چنار میں عزلت گزینی کی اجازت دی۔ (۳) ریاضت و مجاہدے میں جب بائیس ۲۲ سال کی عمر ہوئی تو حضرت حاجی حمید الدین حضور خود تشریف لائے اور خرقۂ خلافت سے نوازا۔

اس معمولی اختلاف کا سبب یا تو امتداد زمانہ کا تصرف ہے، یا پھر ممکن ہے کہ دونوں میں سے ایک اُس جواہر خمسہ کا دیباچہ ہو جو ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء میں کوہستان چنار میں مرتب کیا گیا تھا، اور دوسرا اس جواہر خمسہ کا دیباچہ ہو جس کو خود مصنف نے ترمیم و اضافے کے بعد ۹۵۶ھ/۱۵۴۹ء میں گجرات کے زمانہ قیام میں لکھا تھا، بہر صورت ہماری غرض ان واقعات اور حالات سے ہے جن کا تعلق شاہ محمد غوثؒ سے ہے، اور یہ حالات مستند ماخذوں میں قریب قریب ایک ہی ہیں،

حاجی حمید الدین حضور نے شاہ محمد غوثؒ کو سلسلۂ شطاریہ میں بیعت فرمایا تھا، صاحب مرأت سکندری نے اس کی تصریح کی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"ہدایت پناہی، حقایق دستگاہی، مخترع بدیع الاسلوب فی الکشف و الکرامات حضرت شیخ محمد غوث، طریقہ ایشان شطاری ست، یعنی سلسلۂ ارادت و خلافت

ایشاں بحضرت سلطان العارفین، قطب المحققین، شیخ بایزید بسطامی قدس سرہ منتہی می شود"[۱]

ہندوستان میں شیخ عبد اللہ شطاری (م ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) نے شطاریہ سلسلے کی اشاعت کی، آپ کا سلسلۂ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملتا ہے، جو نویں صدی ہجری میں ایران سے ہندوستان تشریف لائے تھے، آپ کی خواب گاہ (مانڈو) میں ہے، بقول محمد غوثی:

"تمام مشائخ شطار کو ہند میں شاہ عبد اللہ شطاری کی خدمت سے اس مشرب کا حصہ ملا ہے"[۲]

شاہ عبد اللہ شطاری کے چند سال اور چند ماہ بعد خرقۂ خلافت شاہ محمد غوث کو پہنچا،[۳] جس کی ترتیب اوپر سے نیچے یہ ہے، شیخ عبد اللہ شطاری، شیخ محمد علا قاضن، شیخ ابو الفتح ہدایت اللہ، شیخ حاجی حمید حضور، شیخ محمد غوثؒ،

سلسلۂ شطاریہ کے علاوہ شاہ محمد غوثؒ دوسرے سلاسل میں مجاز تھے، بقول مفتی غلام سرور لاہوری:-

"..... گویند کہ شیخ محمد غوث قدس سرہ مقتدائے چہاردہ سلاسل بود، و سیاحت بسیار کردہ و از مشائخ عظام ہر یک خانوادہ فیض باطنی حاصل نمود و بہ خرقۂ خلافت ممتاز گشت"[۴]۔

شاہ محمد غوث نے اپنی تصنیف اوراد غوثیہ میں خود ان سلاسل سے استفادہ کا ذکر کیا ہے،

"چشتیہ، فردوسیہ، سہروردیہ، قادریہ، طیفوریہ، خلوتیہ، ربانیہ، مداریہ وغیرہ"[۵]

مقام شاہ محمد غوثؒ

ملا عبد القادر بدایونی (متوفی ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) جو شاہ محمد غوثؒ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے، تحریر کرتے ہیں:-

"در علوم دعوت اسماء مقتدائے وصاحب تصرف و جذب کامل بود و اجازت این

---

[۱] سکندر بن محمد — مرأت سکندری مطبوعہ بمبئی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء، [۲] گلزار ابرار، ترجمہ اردو ص ۷-۲۸۶
[۳] ایضاً ص ۲۸۷ [۴] خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم [۵] اوراد غوثیہ مطبوعہ ۱۳۱۳ھ (ص ۴-۳۳۲)

علم از برادر بزرگ خویش شیخ پھول کہ صاحب کرامات و خوارق بود حاصل کرد[1]"

مفتی غلام سرور لاہوری تحریر فرماتے ہیں :-

"از اعاظم مشائخ و کبرائے اولیاء متاخرین ہندوستان ست، در طریقت سلسلہ ارادت بخدمت شیخ حاجی حمید کہ از اعاظم خلفائے شاہ قاذن (کذا) بود درست کردہ و شاہ قاذن نعمت خلافت از شیخ عبد اللہ شطاری داشت و سوائے سلسلۂ ظاہری تربیت باطنی از روح پرفتوح حضرت غوث الاعظم محی الدین عبد القادر جیلانی قدس اللہ اسرارہ السامی ہم یافت۔ و بہ کمال مراتب اقطاب و اغواث رسید[2]"

موصوف، شاہ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

"و صاحب اخبار الاخیار می فرماید کہ شیخ محمد غوث چوں بروز اول بقصد ارادت بخدمت شیخ حمید رفت، شیخ حمید برخاست و او را در کنار گرفت و گفت "بیا شیخ محمد غوث"۔ حاضرین پرسیدند کہ ایں شخص را بے آں کہ بہ ایں مرتبہ رسیدہ باشد "غوث" خواند چہ معنی دارد؟ — فرمود، فال نیک است کہ پدر نام پسر خود "شاہ عالم" می نہد اگرچہ او دراں وقت شاہ عالم نمی باشد[3]"

مفتی غلام سرور لاہوری نے ایک اور روایت نقل کی ہے :-

"نقل است کہ در اوائل شیخ محمد غوث از اہل دعوت بود و در قلعہ کلنجر ریاضت دعوت اسمائے الٰہی نمودہ آں کار را چناں بکمال رسانید کہ در ہند ثانی خود نمی داشت آخر کار آں کار را بیکار تصور نمودہ بکار صفائے باطن پرداخت و دریں کار ہم چناں

[1] عبد القادر بدایونی : منتخب التواریخ، جلد سوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ص ۶ [2] مفتی غلام سرور لاہوری : خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۳ء جلد دوم ص ۳۳۲ [3] ایضاً ص ۳۳۳

سعی و جہد نمود کہ یکے از اقطاب وقت شد[1]"

ٹی، ڈبلیو، بیل (T. W. Beal) لکھتا ہے :-

"ہندوستان کے اعاظم صوفیا میں آپ کا شمار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کوہستان چنار کے دامن میں جنگل کے اندر بارہ برس تک ترک نفس کی مشق کرتے رہے۔ آپ کی غذا جنگل کے پھل اور پتوں کے سوا اور کچھ نہ تھی[2]"

موصوف نے کوہستان چنار پر مدت ریاضت ۱۲ سال لکھی ہے، حالانکہ خود شاہ محمد غوث نے جواہر خمسہ میں تیرہ سال چند ماہ تحریر فرمائی ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے لکھا ہے :-

"آپ شیخ ظہور الدین حاجی حضور کے شاگرد تھے، سلسلہ شطاریہ سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ اور آپ کے آٹھ بھائی شیخ حاجی حمید کے مرید تھے[3]"

مقالہ نگار نے پہلے تو شاہ محمد غوث کو شیخ ظہور الدین حاجی حضور کا شاگرد بتایا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ شاہ محمد غوث اور ان کے آٹھ بھائی شیخ حاجی حمید سے بیعت تھے، اس لیے بادی النظر میں پڑھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ظہور الدین حاجی حضور اور شیخ حاجی حمید دو شخصیتیں ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، حاجی حمید الدین حضور ہی کو بعد میں ظہور الدین حضور کہا جانے لگا۔ مقالہ نگار نے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ حاجی حمید کے ساتھ لفظ "حضور" لکھا ہے۔ حالانکہ اصل میں "حصور" ہے، اس کے معنی بے اولاد کے ہیں، چونکہ شاہ حمید الدین کے کوئی اولاد

[1] خزینۃ الاصفیاء ج دوم ص ۳۳۲

[2] T. W. Beale = Orictal Biagreachical Dic- - Tionary, Calcutta 1881. P. 186

[3] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ لیڈن (ہالینڈ) ۱۹۱۳ء ج ۳ ص ۰۸۰ - ۶۸۷

تھی، اس لیے "حصور" کہا کرتے تھے، جو بعد میں کاتب کی ستم ظریفی سے "حضور" بن گیا، ایتھے نے بھی "حضور" لکھا ہے،[۱]

مقالہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ محمد غوث (متوفی ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء) مع آٹھ بھائیوں کے حاجی حمید الدین حصور سے بیعت تھے، مگر معاصر تذکروں میں سے کسی میں یہ بات نہیں دیکھی اور نہ شاہ محمد غوث نے خود لکھی، معلوم نہیں مقالہ نگار کا ماخذ کیا ہے،

تذکروں اور خود شاہ محمد غوث کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے صرف ایک بھائی شیخ پھول، حاجی حمید الدین حصور سے بیعت تھے، چنانچہ محمد غوثی نے لکھا ہے، (بہلول)

"آپ کا لقب فرید الدین احمد اور خطاب جہانگیر، غوث الاولیاء کے بڑے بھائی اور شیخ ظہور حاجی حمید حصور کے خلیفہ ہیں، بے نہایت لوگوں کے دل آپ کے پنجۂ تصرف میں تھے، شاہ سے درویش تک اور بڑے سے چھوٹے تک ایک زمانہ آپ کی خدمت میں مریدانہ زانو تہہ کرتا تھا۔"[۲]

ہمایوں بادشاہ (متوفی ۹۶۴ھ / ۱۵۵۶ء) کو شیخ پھول سے خاص تعلق تھا، اور شاہ محمد غوث سے شرف بیعت حاصل تھا، اور وہ ملکی معاملات میں شیخ پھول سے مشورہ کیا کرتا تھا، اسی لیے مرزا ہندال نے بغاوت کے زمانے میں آپ کو شہید کر دیا تھا، آپ کا مزار قلعہ بیانہ کے قریب ایک پہاڑ پر ہے۔[۳]

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی لکھا ہے:-

"شیخ را برادرے بود شیخ پھول نام کہ بسبب اعتقاد ہمایوں بادشاہ نسبت شیخ بمراتب اعلیٰ رسیدہ بود، و آخر بدست مرزا ہندال شہید شد۔"[۱]

[۱] ہیرمن ایتھے = کیٹلاگ فارسی مخطوطات، انڈیا آفس لائبریری لندن ج اول مطبوعہ ۱۹۰۳ء ص ۱۰۴۲

[۲] محمد غوثی = گلزار ابرار (اردو) ص ۲۳۴ [۳] ٹی، ڈبلیو، بیل = اورینٹل بائیو گرافیکل ڈکشنری: مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ء ص ۱۸۶

نور الدین جہانگیر بادشاہ (متوفی ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) نے لکھا ہے:-

"انھیں اللہ تعالیٰ کے مختلف ناموں کے مختلف اثرات کے علم میں مہارت حاصل تھی، جنت آشیانی (ہمایوں) ان سے نہایت درجے کا ربط خاطر اور انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔"[۲]

کیمبرج ہسٹری میں بھی لکھا ہے:-

"شیخ (پھول) اپنے مشہور و معروف بھائی محمد غوث کی طرح ایک مشہور مذہبی عالم تھے، اور خود ہمایوں کے روحانی مشیر و صلاح کار تھے۔"[۳]

(باقی)

[۱] خزینۃ الاصفیاء، ج ۲ ص ۳۳۳ [۳] ۱۸۷۳ء [۲] نور الدین جہانگیر: تزک جہانگیری (اردو) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء ص ۵۳۵ [۳] Lt - Colonel Sir Wolsdey Haig = The cambridge History of India. Vol. IV Delhi 1957 P. 32

بزمِ صوفیہ

یعنی تیموری عہد سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، بو علی قلندر پانی پتیؒ، شیخ فرید الدین عراقیؒ، خواجہ گیسو درازؒ وغیرہ کے مستند حالات و تعلیمات

مرتبہ:- سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے

ضخامت:- ۵۲۸ صفحے قیمت ۱۲ روپے

علامہ اقبال اور مسئلہ زمان

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم، اے

(۲)

(۳) نیاز صاحب نے لکھا ہے:-

"وقت در اصل نہ جوہر ہے نہ عرض نہ کوئی واقعہ ہے نہ کوئی حادثہ اور وجود کے لیے جن صفات کا پایا جانا ضروری ہے ان میں سے کوئی صفت اس میں نہیں پائی جاتی۔"

بالفاظ دیگر ع ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا[۱]

سوال یہ ہے کہ ایک ایسے امر موہوم کی جو جملہ صفات وجود سے عاری ہے "نکات طرازی" کیا معنی؟ "العدم لا یوصف ولا یوصف بہ" منطق ہی کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ عقل سلیم اور "Common sense" کا بھی تقاضا ہے، لہذا معدوم محض کو اہم قرار دینا توہم پرستی نہیں تو پھر کیا ہے۔ جب زمانہ معدوم و موہوم ٹھہرا تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کب اور کیونکر پیدا ہوا،

۱؎ چنانچہ اوپر مولانا عبدالحق خیرآبادی کا قول مذکور ہوا کہ زمانہ ضعیف ترین نحو وجود سے متصف ہے، ان سے پہلے ملا محمود جونپوری نے منکرین زمانہ کا جواب دینے کے بعد شمس بازغہ میں اعتراف کیا ہے:- "فلا جرم یجب ان یکون موجوداً فی الاعیان و مع ذٰلک فاعلم ان الزمان اضعف الاشیاء وجوداً"۔ ملا محمود نے خود شیخ بو علی سینا کا اعتراف نقل کیا ہے کہ:- "قال الشیخ ینبّہ ان یکون الزمان اضعف وجوداً من الحرکۃ و مجانساً لوجود امور بالقیاس الی امور"۔

بایں ہمہ معاشرتی زندگی کی عملی ضرورتوں کے لیے زمانہ کا حوالہ ناگزیر ہے، اس لیے اسے "بھوتوں کی کہانیوں" کی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے اشاعرہ نے اسے ایک پیمانہ قرار دیا اور بس۔ چنانچہ "شرح المواقف" میں زمانہ کے مذاہب خمسہ کے ضمن میں مذکور ہے:-

خامس المذاہب فی حقیقۃ	حقیقت زمان کے سلسلے میں پانچواں مذہب
الزمان مذہب الاشاعرۃ	اشاعرہ کا ہے، اس کی رو سے زمانہ
وھو انہ متجدد معلوم	ایک تجدد پذیر امر ہے جس سے دوسرے
یقدر بہ متجدد	تجدد پذیر امور کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

مگر علامہ نے معاشرتی زندگی کے اس اہم تقاضا کو "زنار پوشی و باطل فروشی" سے تعبیر کیا ہے

اے اسیر دوش و فردا در نگر	در دل خود عالم دیگر نگر
در گل خود تخم ظلمت کاشتی	وقت را مثل خطے پنداشتی
باز با پیمانۂ لیل و نہار	فکر تو پیمود طول روزگار
ساختی ایں رشتہ از زنار دوش	گشتۂ مثل بتاں باطل فروش[۱]

حالانکہ زمانہ کی اس افادی حقیقت کا احساس ہی مغربی ثقافت کا آغاز تھا، اسپنگلر کہتا ہے کہ کلاسکی (یونانی) عہد کا انسان گھڑیوں کے استعمال سے مستغنی تھا، اور اس کی یہ بے نیازی بالقصد والارادہ تھی، وہ صرف "آن حاضر" ہی میں رہتا تھا، ماضی و مستقبل سے بالکل بے پروا:

Classical man managed to do without the clock, and his abstention was more or less

۱؎ اسرار خودی: اسی کے لیے نیاز صاحب نے لکھا تھا کہ "اقبال نے اسرار خودی میں مسئلہ زمان و مکان کے متعلق بڑے بصیرت افروز نکات پیش کیے ہیں"۔

deliberate .... Classical man's existence .... was wholly contained in the instant. Nothing must remind him of past of furture. (Spengler: Decline of the west vol 1, P. 132

[کلاسکی عہد کا انسان بغیر گھڑی کے گزارا کر لیتا تھا۔ اور اس کی یہ قناعت کم و بیش ارادی تھی.... کلاسیکی عہد کے انسان کی زندگی تمام تر آن حاضر میں منحصر تھی، وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شے اسے ماضی یا مستقبل کی یاد دلائے]

اسی طرح قدیم ہندوستانی ثقافت زمانہ کی اس افادی حیثیت سے ناآشنا تھی۔

"The indians also have no sort of time-reckoning (the absense of it in their case expressing their Nirwan) and no clock and therefore no history, no life memories, no care." (ibid, vol I P. 33

[اہل ہند بھی وقت شماری کا کوئی نظام نہیں رکھتے تھے، (اس کا فقدان ان کے یہاں نروان کا مظہر ہے) نہ ان کے یہاں گھڑی تھی اور اس لیے ان کے یہاں کوئی تاریخ تھی، نہ زندگی سے متعلق یادیں اور نہ کوئی فکر دیرینہ]

بہرحال اس کلاسیکل غنودگی سے بیداری کا آغاز قیصر جولین کے زمانہ میں ہوا، اس مروجہ تقویم کی اصلاح کی اور اس کا قتل "مدت بیزاری" کے اجتماعی احساس کا آخری احتجاج تھا:-

Caesar's reform of the calender may almost be regarded as a deed of emancipation

from the classical life feeling .... His assassination seems to us a last out-break of the antiduration feeling that was incarnate in the polis and the Urbs Roma." (ibid Vol I P. 133)

[قیصر نے جو تقویم کی اصلاح کی تھی اسے کلاسیکی احساس زندگی سے چھٹکارا سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قتل اس مدت بیزاری کے جذبے کا آخری احتجاج تھا جس کی روح "محدود شہروں" اور روحۃ الکبریٰ میں حلول کیے ہوئے تھی]

لیکن زمانہ کی اس افادی حقیقت کا صحیح اندازہ یورپی ثقافت ہی نے لگایا (بقول اسپنجلر) کیونکہ جرمنوں نے (جنھیں اسپنجلر مغربی کلچر کا ممثل اعظم سمجھتا ہے) دیوار گھڑی کو دریافت کیا، وہ لکھتا ہے:-

Among the wastern peoples, it was the Germans who discovered the mechancal clock, the dread symbol of the flow of time. (ibid, Vol I P. 14)

[مغربی اقوام میں یہ شہرت اولیت جرمن قوم ہی کو حاصل ہے کہ اس نے مشین سے چلنے والی گھڑیاں دریافت کیں جو زمانہ کے مرور و انقضاء کی مہیب علامت ہے] (انحلال المغرب ج ۱ ص ۱۴)

اور زمانہ کی اسی افادی حیثیت کے شدید احساس میں یورپی ثقافت کا خصوصی امتیاز مضمر ہے جیسا کہ اسپنجلر لکھتا ہے:-

"Man has never ...... been so awake and, aware so deeply sensible of time...

as he has been in The west. (ibid, Vol I P. 133

[انسان کبھی اتنا بیدار و متیقظ نہیں رہا، اسے کبھی زمانہ کے وجود کا اتنا گہرا احساس تھا جتنا کہ مغرب (یورپی کلچر) میں رہا ہے۔] (انحلال الغرب ج ا ص ۱۳۳)

اور غالباً اسپنجلر کے اسی قول کی صدائے بازگشت تھی جس نے علامہ اقبال سے "زمانہ کے حقیقی ہونے کے شدید احساس کو قرآن کی بنیادی تعلیمات کا اصل و مبنیٰ علیہ" قرار دلوایا، لیکن یہاں وہ "قرآن کی بنیادی تعلیمات کے اس اصل و مبنیٰ علیہ کو "زنار بردوشی و باطل فروشی سے تعبیر فرمانے لگے، فیا للعجب۔

بہر حال اگر زمانہ کی افادی حیثیت کے احساس اور اس سے معاشرتی زندگی میں استفادے کی ترقی سے کسی تہذیب و ثقافت کی بلندی و برتری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو یقیناً اسلامی ثقافت کا درجہ دنیا کی ثقافتوں میں بہت بلند و برتر ہے، اسلام اصولی طور پر وقت کی افادی حیثیت کی قدر سکھاتا ہے، اس کی یہ تعلیم عبادات سے لیکر معاملات تک ہے، نماز کے اوقات اور روزے کی مدت کا، زکوٰۃ کے وجوب اور حج کے تعین کا اسی پر مدار ہے، مرد نمازی صرف طلوع فجر اور طلوع آفتاب ہی میں امتیاز نہیں برتتا، وہ فجر کے اندر غلس اور اسفار کی بھی تدقیق کرتا ہے، سحر صادق کو سحر کاذب سے ممتاز کرتا ہے اور اسی طرح دیگر اوقات میں۔ معاملات کے اندر "اجل مسمّٰی" کا تعین اسی احساس پر مبنی ہے، اور اسی احساس کی شدت نے سلمان ذہانت سے دقیق پیما گھڑیاں ایجاد کرائیں۔ اسپنجلر کہتا ہے کہ ۱۰۰۰ء کے قریب گربرٹ (پوپ سلوسٹر دوم) نے پہیہ کنی سے چلنے والی گھڑی ایجاد کی، جرمنی میں کلاک اور ۱۲۰۰ء کے قریب وجود میں آئے اور جیب گھڑیاں اس کے بعد۔ لیکن اس سے چار سو سال پہلے گھڑیاں اسلامی دنیا میں عام تھیں، اور ہارون الرشید نے جو شارلمین کو تحفہ میں گھڑی بھیجی تھی وہ پہلا "وقت پیما" نہ تھی،

جو سرزمین یورپ میں پہنچا۔ "الوقت سیف قاطع" کے اصول کے ماتحت مسلمانوں نے غیر معمولی صحت کے ساتھ وقت کی پیمائش پر زور دیا، انھوں نے منٹ اور سکنڈ (دقائق و ثوانی) تک ہی اجزاء زمان کی تقسیم کو محدود نہ رکھا بلکہ ثوالث و روابع حتیٰ کہ عواشر تک اسے ضبط کیا۔

لیکن علامہ اقبال اسلامی ذہن کی اس کاوش کو جس میں وہ متمدن دنیا کی "وقت پیمائی" کے طریقوں کا استاد ہے، زنار بردوشی و باطل فروشی سے تعبیر فرماتے ہیں، صرف اتنے سے تصور پر کہ "Pure Duration" کے واہمہ تراشی کی داد نہ دے سکا جس نے قدیم ہخامنشی دور میں بندگانِ خدا کا سر "زروان" کے سامنے جھکوا دیا تھا۔

(۴) نیاز صاحب نے لکھا ہے:۔

"(زمانہ کے متعلق) بہت سے سوالات اقبال کے سامنے بھی تھے، اور ان پر انھوں نے بہت غائر نگاہ ڈالی تھی"۔

علامہ اقبال نے مغربی فلسفہ کا بڑا غائر مطالعہ کیا تھا، جیسا کہ خود فرماتے ہیں:۔

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اس وجہ سے ان کے سامنے زمانہ سے متعلق بہت سے پیچیدہ سوالات تھے، اس کا بڑا سبب اسپنجلر کی تقلید تھی، اسی زمانہ میں اسپنجلر کی "Decline of west" شائع ہوئی تھی اور علامہ اس سے بہت متاثر ہوئے تھے، اور چونکہ اسپنجلر نے یورپی ثقافت کے اصولی ممیزات "یونان بیزاری" اور "احساس زمانہ" بتائے تھے، اس لیے علامہ نے بھی ان دونوں ممیزات کو اسلامی ثقافت کا اصل الاصول قرار دیا،

غرض مغربی فلسفہ کی عقیدت میں زمانہ کے متعلق اقبال کے ذہن میں پیچیدہ سوالات کا پیدا ہوجانا فطری تھا، مگر مغربی فلاسفہ خود انھیں حل نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا ان کی رہنمائی سے مایوس

ہو کر علامہ کی نظریں مفکرین اسلام کی جانب اٹھیں، جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اس ذہنی کشمکش کا نتیجہ وہ لیکچر تھے جو علامہ نے ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد وغیرہ میں "الٰہیات اسلامی کی تشکیل جدید" کے عنوان سے دیئے، مگر اسلام اور اسلامی ثقافت کو صحیح طور پر سمجھنے کی تڑپ ان میں کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو وہ ذہنی پس منظر جو مفکرین اسلام کی کاوشوں کے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے درکار تھا، ان کے پاس بہت کم تھا، چنانچہ علامہ کی اس زمانہ کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ زمانہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے واقف ہونے کی مخلصانہ کوشش کے باوجود وہ اپنی اس خواہش میں ناکام ہی رہے،

صورتِ حال یہ تھی کہ جس وقت انھوں نے یہ لیکچر دیئے اس وقت تک انھیں امام رازی کی "المباحث المشرقیہ" جس کی جلد اول کا آخری حصہ زمانہ کی بحثوں پر مشتمل ہے، دیکھنے کو بھی نہیں ملی، انھوں نے سید سلیمان ندوی مرحوم کو اپنے مکتوب مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء میں لکھا،

"ایک زحمت دینا چاہتا ہوں معاف فرمایئے گا، مباحث مشرقیہ لاہور میں دستیاب نہیں ہو سکتی، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرما دیں، میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا صرف خلاصہ چاہتا ہوں"[1]

معلوم نہیں سید صاحب نے مطلوبہ خلاصہ بھیجا یا نہیں، لیکن اگر بھیجا بھی ہو تو علامہ نے خطبات کی تیاری میں اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں لی، کیونکہ اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی[2]، بہرحال اواخر ۱۹۳۳ء سے قبل علامہ کو "المباحث المشرقیہ" کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا اور اس وقت تک انھیں دوسرے

[1] معارف اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص ۳۰۹ [2] اگرچہ خطبات میں انھوں نے اس کا حوالہ دیا ہے کہ یہ کتاب حال ہی دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے، مگر محتویات کتاب کا کوئی حوالہ نہیں ہے،

متکلمین و متصوفین کے افکار متعلقہ زمان کا بھی کوئی علم نہ تھا، چنانچہ سید صاحب کے نام دوسرے مکتوب مورخہ ۸ اگست ۱۹۳۳ء میں فرماتے ہیں:۔

۱۔ حضرت محی الدین ابن عربی کی فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس جگہ ہے، حوالے مطلوب ہیں،

۲۔ حضرات صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمایئے،

۳۔ متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقت زمان یا آن سیال پر مختصر اور مدلل بحث کونسی کتاب میں ملے گی، امام رازی کی مباحث مشرقیہ میں آج کل دیکھ رہا ہوں"[1]

غالباً سید صاحب نے اس خط کا طمانیت بخش جواب دیا تھا، اور پہلے استفسار کے جواب میں انھوں نے ابن عربی کے خیالات متعلقہ زمان کا خلاصہ خود کرنے اور بھیجنے کی کوشش کی تھی، تیسرے سوال کے جواب میں مولانا برکات احمد صاحب کے رسالہ "اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان" سے استفادہ کرنے کے لیے لکھا تھا، چنانچہ علامہ نے یہ رسالہ جلد ہی منگا لیا مگر اور کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں، مکتوب مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۳۳ء میں لکھا ہے:۔

"والانامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں، رسالہ اتقان فی ماہیۃ الزمان آج مل گیا، میں نے اس کے لیے ایک دوست کو ٹونک لکھا تھا آج مولوی برکات احمد کا ایک اور رسالہ کے لیے جو اردو میں لکھا ہے، ہندی فلسفی ساکن پھلواری مصنف تسویلات فلسفہ کا نام کیا ہے..... شرح مواقف دیکھ رہا ہوں، فتوحات کا مطالعہ آپ کا ملخص آنے کے بعد دیکھوں گا، ...... علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے"[2]

[1] معارف اکتوبر ۱۹۵۴ء ص ۳۱۳ [2] ایضاً ص ۳۱۴

لیکن علامہ نے مولانا برکات احمد کے رسالے کو کہاں تک سمجھا، اس کا اندازہ ان کے مکتوب بنام سید سلیمان ندوی مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء سے ہو سکتا ہے:-

"حضرت ابن عربی کے خیالات دہر کا بھیجنے کا جو وعدہ آپ نے فرمایا ہے اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں، مولوی سید برکات احمد صاحب کا رسالہ میں نے دیکھا ہے، انشاء اللہ اسے سبقاً سبقاً پڑھوں گا، مسئلہ آن کے متعلق ابھی مشکلات باقی ہیں...... مولوی سید برکات احمد مرحوم نے دہر اور زمان میں امتیاز کر کے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن حق یہ ہے کہ مسئلہ نہایت مشکل ہے۔"[1]

خط کشیدہ الفاظ سے اس بات کی بخوبی تصدیق ہو سکتی ہے کہ زمانہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے واقف ہونے کی مخلصانہ کوشش کے باوجود علامہ اپنی اس خواہش میں ناکام ہی رہے، "دہر" اور "زمان" کا امتیاز مولوی برکات احمد صاحب کا اختراع نہیں ہے، ان سے سات سو سال پہلے امام رازی کی "المحصل"[2] میں اور تقریباً ایک ہزار سال پہلے شیخ بوعلی سینا کے یہاں یہ امتیاز ملتا ہے[3]، اور حالانکہ امام رازی نے اس تدقیق کو شیخ بوعلی سینا کی طرف منسوب کیا ہے[4]، لیکن یہ شیخ سے بھی پہلے کی ہے کیونکہ ابوحیان التوحیدی نے "کتاب المقابسات" میں ابوسلیمان سجستانی کی ایک تقریر متعلقہ زمان کے اندراس کا حوالہ دیا ہے[5]، نیز البیرونی نے کتاب الہند میں محمد بن زکریا الرازی طبیب مشہور کی جانب اس قسم کی ایک تدقیق منسوب کی ہے۔[6]

اس سے زیادہ حیرت خیز امر یہ ہے کہ مولانا برکات احمد صاحب اپنے اکابر کی تبعیت میں خود اس تدقیق کے منکر، اس سے بیزار اور اس کے درپئے انہدام ہیں، وہ مسئلۂ زمان کی مشکلات

۱؎ معارف نومبر ۱۹۵۵ء، ص ۳۰۴ ۲؎ المحصل للرازی ص ۶۲ ۳؎ عیون المسائل مشمولہ رسائل تسع لابن سینا ص ۱۰۷ ۴؎ المقابسات ص ۲۶۲ ۵؎ کتاب الہند ص ۱۶۳-۱۶۴ ۶؎ المباحث المشرقیہ جلد اول ص ۶۴۵

کو کم کیا کریں گے، وہ تو اس تدقیق کا بار بار حوالہ دے کر ان مشکلات کو اور بڑھاتے ہیں، معلوم نہیں رسالہ "اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان" [جو کوئی پچاس صفحہ کا ایک چھوٹی تقطیع کا رسالہ ہے] کی کس عبارت سے علامہ نے یہ مطلب نکالا ہے کہ مولوی برکات احمد صاحب نے "دہر اور زمان میں امتیاز کر کے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے"۔

اس سے زیادہ مضحکہ خیز ایک اور واقعہ ہے، علامہ اقبال نے میر غلام بھیک نیرنگ کی معرفت مولانا معین الدین اجمیری سے زمان یا دہر پر مضمون لکھوایا تھا[1]، مولانا اجمیری خاتم المتکلمین مولانا فضل حق خیرآبادی کے سلسلۂ تلمذ کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ اس مکتب فکر میں فلاسفہ کے نظریات متعلقہ دہر و زمان کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی حیثیت سے جائزہ لیا جاتا تھا، مولانا فضل حق خیرآبادی نے میر باقر داماد کی "افق المبین" پر بھی حاشیہ لکھا تھا، میر باقر داماد کا نام اسلام کی تفکیر متعلقہ زمان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، وہ خود "حدوث دہری" کے نظریے کے مخترع تھے، اس لیے خیرآبادی خاندان میں اس نظریہ پر خصوصیت سے تبصرہ کیا جاتا تھا، خود مولانا اجمیری کے استاد مولانا برکات احمد صاحب نے "الحجۃ البازغہ فی شرح حکمۃ البالغہ" میں "حدوث دہری" کے ابطال میں متعدد دلیلیں دی ہیں، اس لیے قدرتی امر ہے کہ مولانا اجمیری نے اپنے محولۂ بالا مضمون میں "میر باقر داماد" اور ان کی آراء و افکار کا خلاصہ دیا ہوگا، لیکن علامہ اس فکری پس منظر سے خالی الذہن تھے، جو اسلامی فکر کے ان مغلق مباحث کو کماحقہ سمجھنے کے لیے درکار ہے، اس لیے وہ اسے جہاں تک سمجھ سکے ہوں گے ظاہر ہے اور انگریزی ترجمہ کے بعد اس کا جو حشر ہوا ہوگا وہ کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں ہے،

مگر ان سب باتوں کے لیے معذرت کی جا سکتی ہے، سوائے ایک بات کے: علامہ نے اسلامی فکر کی تاریخ اور اس کے مشاہیر سے بھی خود کو آشنا بنانے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی،

۱؎ "باغی ہندوستان" مصنفہ مولانا عبدالشاہد خان شروانی

انھوں نے ان "میر باقر داماد" کے نام جو نظریۂ "حدوث دہری" کا مخترع کی حیثیت سے اسلامی فکر کے اندر نظریہ زمان کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں، ایک کا دو بنا دیا، چنانچہ خطبات (ص ۱۰۶) میں فرماتے ہیں:-

"This is what Mir Damad and Mulla Baqir Mean when They say That time is born with The act of Creation."

ظاہر ہے جب علامہ سے مفکر کی شخصیت کے سمجھنے میں یہ تسامح ہو سکتا ہے تو اس کے فکری دقائق کی صحیح ترجمانی کی ان سے کہاں تک توقع کی جا سکتی ہے۔

غرض مغربی فلسفہ کی نارسائی سے مایوس ہو کر انھوں نے مشرقی تفکیر کے دامن میں پناہ ڈھونڈی لیکن وہاں اگر مسائل کے حل کرنے کی دقت تھی، تو یہاں مسائل کو سمجھنے ہی میں اشکال تھا، وہاں نارسائی کا اعتراف تھا، یہاں حقیقت رسی کا مغالطہ۔

(۵) نیاز صاحب نے لکھا ہے:-

"وہ وقت و زمانہ کی اہمیت کے اس درجہ قائل تھے کہ اسے انسان کی موت و حیات کا مسئلہ سمجھتے تھے۔"

یہاں نیاز صاحب نے اپنی طرف سے تصرف فرمایا ہے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے "اقبال کا تصورِ زمان و مکان" میں لکھا ہے:

"ان کا (علامہ کا) خیال ہے کہ زمان و مکان کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"

خود علامہ خطبات میں فرماتے ہیں:-

"دوسری طرف اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص ذہنی مسائل ہوں یا مذہبی نفسیات یعنی اعلیٰ تصوف کے مسائل ہوں، سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو لیا جائے۔ ظاہر ہے جس تہذیب کا مطمحِ نظر یہ ہو اس میں زمان و مکان کا سوال درحقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

(الٰہیات اسلامی کی تشکیل جدید)

لیکن علامہ سے اسلامی تہذیب کی تاریخ کے سمجھنے میں تسامح ہوا ہے، زمانہ (یا زمان و مکان) کا مسئلہ اسلامی فکر میں صرف اتنی حیثیت رکھتا ہے کہ غیر اسلامی فکر کے نمایندے ان اصنامِ خیالی کے آبگینے تراشتے رہیں اور توحید کے دیوانے اس کارگہ شیشہ گری کو پاش پاش کرتے رہیں، تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی فکر میں جب پہلی مرتبہ ژولیدگیٔ وہم و تخییل کے اس ڈھکوسلے کا نام آیا تو فوراً اسے بندگانِ ظن و تخمین کی اختراع سے تعبیر کیا گیا، چنانچہ جب وقت زمانہ قریش نے کہا

وَمَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيٰى وَمَا يُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ

اور کچھ نہیں بس یہی ہے ہمارا جینا دنیا کا، ہم جیتے اور مرتے ہیں اور نہیں ہلاک کرتا ہم کو مگر زمانہ۔

تو فوراً وحی نازل ہوئی

وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ

اور ان کو کچھ خبر نہیں اس کی وہ محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

اس برجستہ گرفت نے اس باب میں اسلامی فکر کے موقف کو ہمیشہ کے لیے متعین کر دیا۔

اسی طرح جب مہبطِ وحیؐ کو معلوم ہوا کہ مقاصد زندگی میں ناکام افراد کی زبان پر

"تبا للدہر" اور "یوسا للدھر" کی مغلظات اور ملاحیاں جاری ہیں تو "معلم کتاب و حکمت" نے بتادیا
کہ زمانہ کو سب وشتم نہ کرو کیونکہ ان مصائب و نوائب کا نازل کرنے والا وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت
میں زمانہ ایک آلہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)۔ چوتھی صدی ہجری
تک مفکرین اسلام کی تمام جماعتوں مفسرین، محدثین اور فقہاء و متکلمین کا اس پر اتفاق رہا، پانچویں
صدی سے غیر اسلامی (یونانی و ایرانی) افکار کے عقیدتمندوں نے زمانہ پرستی کو نئی نئی شکلوں میں
پیش کیا، مگر متکلمین نے

ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش — من انداز قدت را می شناسم

کے مصداق اسے پہچانا اور اس معرکۂ حق و باطل میں اپنا فرض منصبی پورا کیا۔

غرض اسلامی فکر کی تیرہ سو سال کی تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی تہذیب میں زمان و مکان
کے مسئلے کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی، زندگی اور موت کا سوال بنانے کا تو ذکر ہی کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ مسئلہ زمان کے ساتھ علامہ کا یہ غیر معمولی شغف ان کے میلان تجدد پسندی
کا نتیجہ تھا، یورپی کلچر "سائنس اور طبعیات کا کلچر" ہے۔ طبعیاتی تفکر کے نتیجے میں مغرب کے فلاسفہ
اور سائنس دانوں کو زمان و مکان کی حقیقت پر غور کرنا پڑا اور یہ مسائل ان کی فکری کاوش
کے ناگزیر موضوع بن گئے۔ چنانچہ ایک جرمن فلسفی سائنسدان موریتس شلک لکھتا ہے:-

The most fundamental conception in physics are those of space and time .... The effort of physicists had always been directed sloey to all the substratum which occupied space and time .... space and

time were regared, so to speak as vessels containing this substratuem and furnished fixed systems of refence." (Mortz Schellick: Space and Time in Contemparary Physics, P.2)

[طبعیات کے سب سے زیادہ بنیادی تصورات زمان و مکان کے ہیں، ماہرین طبعیات کی
کوشش ہمیشہ خاص طور سے ان چیزوں کی طرف مبذول رہی ہے جو زمان و مکان پر مشتمل ہیں
..... ایسا سمجھا جانا چاہیے کہ زمان و مکان ایک طرح کے ظروف ہیں جو ان چیزوں پر
مشتمل ہیں اور جو تعیین وضع کے لیے ثابت و مستقر حوالجات مہیا کرتے ہیں]

ایسا خیال ہوتا ہے کہ علامہ کو جو یورپی انداز فکر سے بیحد متاثر تھے، اندیشہ تھا کہ یہ
"اہمیت مفرط" مشرق میں جہاں سائنس اور طبعیات نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی، کچھ زیادہ
درخور اعتنا نہ سمجھی جائے گی، اس لیے انھوں نے بغیر کسی معقول وجہ کے اس کے لیے ایک تاریخی توجیہ
تراش لی، حالانکہ اسلام کی فکری و ثقافتی تاریخ کا مطالعہ اس اختراعی توجیہ کی کسی طور پر
تائید نہیں کرتا، مگر علامہ کو "طبع مشرق" کا پورا پورا اندازہ تھا، اسی لیے انھوں نے طبعیات
کے بجائے "مسائل تصوف" کا سہارا لیا۔

(۶) نیاز صاحب نے لکھا ہے:-

"زمانہ ان کے یہاں رات دن کا نام نہیں تھا، بلکہ اس کا تعلق ارتقائے تھا، اس عینیت
سے تھا جس میں وجود اور وجوب خلق کا فرق و امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا"

جس طرح ایک بگڑا ہوا متفکر اپنی ژولیدگی تخیل کے لیے عرفانیات کے دامن میں پناہ
ڈھونڈتا ہے اسی طرح ایک بگڑا ہوا ادیب اپنی پریشاں گفتاری کے لیے خوشنما اور مہیب الفاظ

کے طلسم کا سہارا لیتا ہے، مسئلۂ ارتقا ہو یا دیگر مسائل علمیہ ان کی تعبیر و توجیہ خالص منطقی بنیادوں پر ہونی چاہیے، سائنٹفک استدلال کے بجائے ادراکِ حقایق کو عرفانی تجارب کے سپرد کرنا کوئی علمی خدمت تو نہیں ہے،

زمانہ کا ارتقائی تصور برگسان کا مذہب ہے جس کی تقلید علامہ کی نظروں میں فقدانِ خودی کے مترادف ہے

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا　　زناریٔ برگساں نہ ہوتا

زمانہ کے باب میں بڑے مذاہب پانچ ہیں، جن میں سے تین فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور دو طبیعات سے

(۱) مذہب طبیعی: اس میں مرکزی شخصیت ارسطو کی ہے، کانٹ سے پیشتر یہ تمام فلسفی مدارس کا مسلمہ مسلک تھا،
۲۔ مذہب انتقادی: اس کا واضع کانٹ ہے، ۳۔ مذہب حیاتی یا ارتقائی: اسے برگسان نے پیش کیا،
۴۔ مذہب مطلق: اس کا ممثل نیوٹن ہے۔ اور ۵۔ مذہب نسبی: اس کا علمبردار آئینسٹائن ہے۔

ان مذاہب خمسہ میں سے برگسان کا مذہب یہ تھا کہ زمانہ "مدت بحت Pure Duration" ہے جس میں تعاقب (Succession) ہے، مگر تغیر (Change) نہیں ہے، اقبال نے بھی اسی مسلک کی تصویب کی ہے، اور زمانہ کے اس تصور کو انائے باطنی کا وظیفہ بتایا ہے جسے وہ "Appreciative self" سے تعبیر کرتے ہیں اس طرح اس "انائے مدرک" کا زمانہ: ایک واحد اب (Single Now) جس میں ماضی، حال اور مستقبل کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ لیکن یہ کوئی تصور نہیں ہے، حکمائے اسلام اس سے زیادہ منطقی انداز میں اس تدقیق کو پیش کر چکے ہیں۔ "دہر" اور "سرمد" کے تصورات کو برگسان اور اقبال کی "Pure Duration" سے کہیں زیادہ منطقی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مگر نتیجہ "ہذا التہویل خال عن التحصیل"[۱] سے زیادہ وقیع ثابت نہ ہوا۔

[۱] المحصل للرازی ص ۷۲

نیاز صاحب کہتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک زمانہ رات دن کا نام نہیں ہے، معلوم نہیں انھوں نے اقبال کے کس قول سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے، ایجابی طور پر بقول مصنف رزم اقبال زمانہ ہی کا دوسرا نام تقدیر ہے، ویسے گردشِ لیل ونہار اور سلسلۂ روز وشب ہی اقبال کے نزدیک "نقش گر حادثات" اور "اصلِ حیات و ممات" ہیں۔

اسی طرح نیاز صاحب کی یہ انشا پردازی کہ زمانہ اس "عینیت سے مراد ہے جس میں وجود اور وجوبِ خلق کا فرق و امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا"، محض مہیب الفاظ کا ایک طلسم ہے، جس میں کوئی معنوی نظم اور منطقی ربط نہیں ہے، کیا اچھا ہوتا کہ وہ ان ثقیل فلسفیانہ مصطلحات کے استعمال میں اتنا اسراف نہ فرماتے،

(۷) نیاز صاحب نے اس ہیبت ناک "عینیت" کی مثال میں لکھا ہے:

"زمانہ کا تعلق اس عینیت سے تھا جس میں وجود اور وجوب خلق کا فرق و امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا اور جس کو صوفیانہ لب ولہجہ میں یوں ظاہر کیا ہے:

نہ ہے زماں نہ مکاں ـــــ لا الہ الا اللہ" ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

"نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ" ذہن اقبال کا اس وقت کا کارنامہ ہے جب ان پر توحید الوہیت کا غلبہ تھا، بعینہٖ "وجود اور وجوب خلق کے فرق و امتیاز" کی سرحدیں مٹانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں، توحید [نفی غیر اللہ] وحدت الوجود [نا آں غیر اللہ] سے بنیادی طور پر مختلف ہو دبستان ہیں۔

پس اگر "صوفیانہ لب ولہجہ" سے توحید الوہیت کے علمبردار کا لہجہ مراد ہے تو یہ بات صحیح ہے لیکن اگر عجمی نام نہاد "توحید وجودی" کے مبلغین کا لہجہ مراد ہے تو یقیناً غلط ہے۔

(باقی)

نارجیل سے نخیل تک

از

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۵)

عرب میں ہندوستانیوں کی آبادیاں

ہندوستان کے شمال و مغرب کے ساحلی مقامات، اور عرب کے شمال و مشرق کے ساحلی مقامات ایک دوسرے کے سامنے واقع ہیں، درمیان میں بحر ہند (جسے بحر عرب اور بحر فارس بھی کہتے ہیں) حائل ہے، اسی سمندر کے ذریعہ دونوں ممالک میں تاریخ کے قدیم دور سے تعلقات چلے آرہے ہیں، اور دونوں کے ساحلی علاقے ایک ملک کے دو علاقے کی حیثیت سے رہے ہیں۔ عرب و ہند کے قدیم تعلقات ابتدا میں صرف تجارتی اور معاشی تھے، مگر بعد میں فکری، تمدنی، اور ثقافتی تعلقات بھی پیدا ہو گئے، بلکہ تجارتی و اقتصادی تعلق کو فکری اور ثقافتی تعلق نے اور زیادہ مضبوط کر دیا۔

اس کے باوجود قدیم تاریخ میں ہندوستان کے کسی ساحلی یا غیر ساحلی مقام پر عربوں کی آبادی کا پتہ نہیں چلتا جو یہاں آکر مستقل طور سے آباد ہو گئے ہوں، حالانکہ عرب کے مقابلہ میں ہندوستان ہر اعتبار سے ترقی یافتہ ملک تھا اور عربی زندگی کے مقابلہ میں یہاں کی زندگی میں رنگینی اور دلفریبی زیادہ تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب تاجر ہندوستان آئے اور تجارتی مقصد پورا کرکے واپس

چلے جاتے تھے، اور اپنی آزاد عربی زندگی پر کسی دوسری زندگی کو ترجیح نہیں دیتے تھے، عربی زندگی ان کے لیے بہت ہی دلفریب اور خوشگوار تھی، ہندوستان میں سب کچھ ہونے کے باوجود ان کو یہاں وہ کھلی ہوا اور آزاد فضا میسر نہیں تھی، جو عرب میں حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ہمیں کسی قدیم عرب آبادی کا پتہ نہیں چلتا ہے، اور نہ یہاں پر عربوں کے بہت زیادہ دنوں تک ٹھہرنے کا ثبوت ملتا ہے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے ایسے باشندے عرب میں کثرت سے ملتے ہیں جو وہاں جاکر مستقل طور پر وہ بس گئے، اور ہندوستان کی قومیت و وطنیت چھوڑ کر عرب کے باشندے ہو گئے، اور ان کو عربوں نے عربی زندگی میں اس طرح ضم کر لیا کہ وہ بالکل عرب بن گئے، ہندوستانیوں کے ساتھ عربوں کے اس حسن سلوک اور رواداری کی وجہ ان کی فطری وسعت قلب اور مہمان نوازی تھی جو دور جاہلیت میں بھی ان کی امتیازی صفت تھی، اس کے ساتھ ہی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ عربوں کو گھر بیٹھے ان ہندوستانیوں کے ذریعہ ضروریات زندگی کی چیزیں مل جاتی تھیں اور ان کو ان کے لیے ہندوستان کا بحری سفر نہیں کرنا پڑتا تھا، ابتدا میں بہت سے ایسے ہندوستانی باشندے عرب میں جاکر آباد ہو گئے جو تاجر تھے، اور عربوں کی ضرورت کا سامان ان کے میلوں اور بازاروں میں لیجا کر فروخت کرتے تھے، ان تاجروں کو عرب بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور نہ صرف یہ کہ ان کو لوٹتے مارتے نہیں تھے، بلکہ ان کی حفاظت کرکے حق جوار کا پورا لحاظ کرتے تھے، چنانچہ عرب کے کئی بڑے قبائل نے ایسے ہندوستانی باشندوں کو اپنی "ولاء" میں لے لیا تھا، اور ان کو وہ اپنے قبیلہ کا فرد شمار کرتے تھے، پھر چونکہ ہندوستان کے لوگ بت پرستی میں جاہلی عرب کے تقریباً ہم مشرب تھے، اس لیے اور بھی دونوں ملکوں میں تعلقات استوار ہوئے، چنانچہ عرب کے یہود و نصاریٰ کے علاوہ مشرک، مجوسی، صابی وغیرہ ہندوستانیوں کو اپنا ہم مشرب گردانتے تھے، اور بت پرستی اور دوسرے عقائد و اعمال بڑی حد تک ہم رنگ تھے، اس لیے انہیں میں

مذہبی اختلاف بھی نہیں تھا، اسی طرح بہت سے عادات و خصائل اور رسوم و رواج میں عرب اور ہندوستانی تقریباً متفق و متحد تھے، اس لیے ہندوستان کے باشندے عرب میں بڑی آسانی سے کھپ گئے[1]۔

عربوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ایران کے بادشاہ بلوچستان سندھ اور مرندیب وغیرہ پر قابض تھے، اور ان علاقوں کے ہندوستانی باشندے جاٹ اور مید وغیرہ ایرانی فوج اور حکومت میں شامل تھے، اور کسرائیوں کی مخصوص شاہی فوج اسوار میں شامل ہو کر عرب کے ایرانی مقبوضات میں آباد ہو گئے تھے، اس طرح عراق کے اہم ایرانی مقبوضہ ابلہ (بصرہ) سے لیکر یمن تک ایرانی فوجوں کی طرح یہ بھی پھیلے ہوئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پہلے عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل پر ہندوستانی باشندوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی، اور وہاں کی ملکی اور قومی زندگی میں ان سے شدید خطرات محسوس ہونے لگے تھے، چنانچہ یمن پر جب حبشیوں نے قبضہ کیا تو وہاں ہندوستان کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب یمن کے سابق عرب حکمران سیف بن ذی یزن نے ایران کے بادشاہ کسریٰ انوشیرواں کے دربار میں پہنچکر اپنا حال بیان کیا اور اجنبی لوگوں کے غلبہ کا واقعہ سنایا تو کسریٰ انوشیرواں نے سیف بن ذی یزن سے پوچھا کہ تمھارے ملک پر کن اجنبی لوگوں نے قبضہ کیا ہے؟ وہ حبشی ہیں یا سندھی۔

فقال ایها الملك غلبتنا	سیف نے کہا اے بادشاہ! ہمارے ملک پر اجنبی
علی بلادنا الاغربة، فقال	لوگ غالب آگئے ہیں، کسریٰ نے پوچھا کون اجنبی
له کسریٰ ای الاغربة الحبشة	حبشی یا سندھی؟ تو یوسف نے کہا سندھی نہیں،
ام السند، فقال بل الحبشة[2]	بلکہ حبشی غالب آگئے ہیں،

[1] سیرت ابن ہشام طبع جدید مصطفےٰ محمد مصر ج ۱ ص ۴۰ و کتاب التیجان کلبی طبع حیدرآباد ص ۴۰، ۳۰۰ و تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۱۷ مطبع حسینیہ مصر،

تاریخ طبری کی ایک روایت میں ہے:۔

قال ایها الملك ان السودان	سیف نے کہا اے بادشاہ! کالے لوگوں نے ہمارے
قد غلبونا علی بلادنا و رکبوا	ملک پر غالب آکر ہمارے ساتھ نہایت برا
منا امورا شنعة، اجل الملك	برتاؤ کیا ہے جن کا تذکرہ بادشاہ کے سامنے
عن ذکرها الخ (ص ۱۱۷)	مناسب نہیں ہے،
قال قد علمت ان بلادکم کما	یہ سنکر کسریٰ نے کہا ہاں تمھارا ملک بہت ہی
وصفت فای السودان غلبوا	زرخیز اور اچھا ہے، بتاؤ کن کالے لوگوں نے
علیها الحبشة ام السند[1]	اس پر غلبہ حاصل کر لیا ہے؟ حبشی یا سندھی؟

اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد عرب کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں کس قدر ہندوستانی موجود تھے، اور ان کو کتنی شوکت و قوت حاصل تھی، یہ واقعہ آپ کی ولادت کے بعد کا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال بعد کا ہے، پروفیسر فلپ حتی نے تاریخ العرب میں لکھا ہے کہ ولادت نبوی کے بعد ۵۷۵ء میں یمن پر ایران کا قبضہ ہوا[2]، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۵۷۱ء میں ہوئی ہے، یمن پر مسروق بن ابرہہ نے چڑھائی کی تھی، جس کے باپ ابرہہ نے اپنے دور حکومت میں کعبہ پر فوج کشی کی تھی، اور اس واقعہ کے ۵۵ دن بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے[3]، سیف بن ذی یزن کی فریاد پر کسریٰ انوشیرواں نے یمن پر اپنی فوج بھیجکر قبضہ کیا اور عراق سے لیکر یمن تک کا علاقہ اپنے قلمرو میں شامل کر لیا۔

[1] تاریخ طبری مطبعہ حسینیہ مصر ج ۲ ص ۱۱۸ [2] تاریخ العرب حتی، طبع مصر ص ۹۰ [3] رحمۃ للعالمین ج ۱ حاشیہ

جیسا کہ معلوم ہوا یمن اور اس کے اطراف میں پہلے ہی سے سندھیوں کی بڑی جمعیت موجود تھی، اور ان کو قوت و شوکت حاصل تھی، انوشیروان کے یمن پر قبضہ کے بعد عرب میں ہندوستانیوں کی اور بھی کثرت ہو گئی اور اساورہ (شہسواران ایران) میں شامل ہونے کی وجہ سے انھوں نے وہاں کے ملکی اور سیاسی معاملات میں حصہ بھی لیا،

امام ذہبی نے تجرید اسماء الصحابہ میں یمن کے آخری ایرانی حکمران کا نام جو حیات نبوی ہی میں مسلمان ہو گئے تھے، باذانؓ ملک الہند لکھا ہے،[1] مگر حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں اس کی تضعیف کی ہے، اور اس کی جگہ ملک الیمن کو صحیح قرار دیا ہے،[2] اس پر مفصل بحث اپنے مقام پر آئے گی، اسی طرح یمن میں کسریٰ کے زمانہ سے ایک ہندوستانی بزرگ بیرزطن ہندی موجود تھے، جو عہد رسالت میں مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے یمن کے اطراف میں حشیش القنب (بھنگ) کو بطور دوا متعارف کرایا تھا اور علاج و معالجہ میں اس کو رواج دیا تھا،[3] غالباً یہ طبیب تھے، ان کے حالات اپنے مقام پر آئیں گے،

یمن قدیم زمانہ سے ہندوستانی مال کی بہت بڑی منڈی تھا اور یہاں ہندوستان کے تاجر ہمیشہ آتے جاتے رہتے تھے، فجر الاسلام کے مصنف نے لکھا ہے:-

وکان لسکان الیمن قدیما	قدیم زمانہ سے یمن کے باشندوں کے تعلقات
علاقات بالھند والشرق	ہندوستان اور مشرق ادنیٰ سے
الادنی[4]	قائم تھے،

اسی کتاب میں دوسرے مقام پر ہے:-

وکانت التجارۃ قدیما نی	قدیم زمانہ سے تجارت اہل یمن کے

[1] تجرید اسماء الصحابہ ج ا ص ۵۸ طبع حیدرآباد [2] الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ا ص ۱۶۹ [3] الاصابہ ج ا ص ۱۱۸
[4] فجر الاسلام ج ا ص ۳

ید الیمنیین وکانوا ھم العنصر	ہاتھ میں تھی اور اس میں یہی لوگ غالب نظر
الظاہر فیھا فعلی یدھم کانت	آتے تھے، ان ہی کے ہاتھوں حضرموت
تنقل غلات حضرموت	ظفار کی پیداوار اور ہندوستان
وظفار، وواردات الھند	کی اشیاء شام اور مصر جاتی
الی الشام ومصر[1]	تھیں،

ان تصریحات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ یمن کا پورا علاقہ ہندوستان کے تاجروں سے آباد تھا، اور ان کی بڑی تعداد وہاں تجارت میں مشغول تھی،

جس طرح یمن کے حدود میں ہندوستانیوں کی کثرت تھی، اسی طرح عرب کے شمال مشرق اور عراق میں قدیم زمانہ سے ہندوستان کے جاٹ اور سیابجہ رہتے تھے، عراق کا مرکزی شہر ابلہ چین، ہندوستان اور ایران وغیرہ کے تجارتی جہازوں کی بہت بڑی بندرگاہ تھا، اور اسے ہندوستان سے بہت پرانا اور بہت گہرا تعلق تھا، جس کی وجہ سے عرب اسے ارض الہند اور فرج السند والہند کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے، شاہان ایران ابلہ پر قبضہ کرکے ایک طرف خشکی کے راستہ سے عرب پر حملہ آور ہوئے تھے اور دوسری طرف بحری راستہ سے ہندوستان پر حملہ کرتے تھے، تاریخ طبری واقعات ۱۲ھ میں ہے:-

وکان فرج الھند اعظم	اور فرج الہند (ابلہ) ایرانیوں کے بڑے
فروج فارس شانا واشدھا	اہم مرکزوں میں تھا، یہاں ان کو بڑی
شوکۃ وکان صاحبہ یحارب العرب	شان و شوکت حاصل تھی، یہاں کا حاکم خشکی
فی البر والھند فی البحر[2]	میں عرب سے اور سمندر میں ہندوستان سے جنگ

[1] فجر الاسلام ج ا ص ۱۳ [2] تاریخ طبری ج ۴ ص ۵ ونیز کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۴۷

ظاہر ہے کہ ان بری اور بحری حملوں میں ہندوستان کے وہ جاٹ اور مید ضرور شامل ہوتے ہوں گے، جو شاہان ایران کی فوج میں قدیم زمانہ سے موجود تھے، خاص طور سے ہندوستان پر حملہ کی صورت میں ان کو اپنی خدمات پیش کرنے کا بہترین موقع ملتا رہا ہوگا،

عراق سے ہندوستان پر ایرانیوں کے بحری حملہ کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد طفولیت تک جاری رہا، چنانچہ کسریٰ انوشیروان نے یمن پر قبضہ کرنے کے بعد ہی ہندوستان پر بڑا زبردست حملہ کیا، اور سرندیپ کو تہ و بالا کر کے یہاں سے بے شمار دولت حاصل کی، امام طبری نے اس حملہ کی تفصیل یہ بیان کی ہے:-

فلما دانت لكسرى بلاد اليمن	جب بلاد یمن کسریٰ کے مطیع ہو گئے تو
وجه الى سرنديب من بلاد	اس نے ہندوستان کے شہر سرندیپ پر
الهند، وهي ارض الجواهر	(جو جواہرات کا ملک ہے) اپنے ایک فوجی
قائداً من قواده في جند كثيف	افسر کو بھاری لشکر کے ساتھ بھیجا جس نے
فقاتل ملكها فقتله واستولى	راجہ کو قتل کر کے ملک پر قبضہ کر لیا
عليها، وحمل الى كسرى منها	اور وہاں سے کسریٰ کی خدمت میں
اموالاً عظيمة وجواهر كثيرة[1]	زر و جواہر اور مال و دولت بھاری مقدار میں

ہندوستان کے جاٹ اور مید ایرانیوں کی ان مہمات میں اپنی خدمات پیش کرتے تھے،

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:-

"عربوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کا ایک اور ذریعہ بھی تھا، اسکی صورت یہ تھی کہ شہنشاہ ایران کا قبضہ بلوچستان اور سندھ پر اکثر رہا، اس قبضہ کے تعلق سے

[1] تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۲۴۴، اور تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۷۷ طبع مصر،

بعض جنگجو قبیلوں کے فوجی دستے ایرانی فوج میں داخل تھے، ان جنگجو قبیلوں میں سے دو کا ذکر عربوں نے کیا ہے اور وہ جاٹ اور مید ہیں، یہ دونوں سندھ کی مشہور قومیں تھیں[1]"۔

ابلہ کے علاوہ بھی عراق میں ہندوستانیوں کی بہت بڑی تعداد رہتی تھی، اور قدیم زمانہ سے اس کو اپنا وطن بنا چکی تھی، اس کا ثبوت بلاذری کے اس بیان سے ملتا ہے:

فانضم الى الاساورة السيابجة	سیابجہ ان اساورہ کے ساتھ مل گئے
وكانوا قبل الاسلام بالسواحل	جو اسلام سے پہلے سواحل میں موجود تھے،
وكذلك الزط، وكانوا بالطفوف	اسی طرح جاٹ بھی عراق کے سواحل میں تھے اور
ينتجعون الكلاء[2]	یہ سب چارے کی تلاش میں کناروں کا چکر لگاتے تھے

یہ عہد فاروقی کا واقعہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایرانی فوج نے پیش کش کی کہ ہم مسلمان ہو کر بصرہ میں آباد ہونا چاہتے ہیں اور اسلامی جہاد میں مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیابجہ اور جاٹ عراق کے سواحل اور طفوف میں رہا کرتے تھے، جو عام طور سے مویشی پالتے تھے، اور چارہ کی تلاش میں سواحل کا چکر لگاتے رہتے تھے، اور عرب کی بدوی زندگی اختیار کر کے ان اطراف میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے، یہ ہندوستانی ان ہندوستانیوں کے علاوہ تھے، جو ایرانیوں کی فوج میں شامل تھے،

یہ لوگ خلیج عربی کے پورے عرب ساحل میں پھیلے ہوئے تھے، جس میں عمان، مسقط، قطیف، بحرین، قطر، کویت اور بصرہ سب ہی شامل تھے،

خلیج عربی کے سواحل اور طفوف میں ہندوستانیوں کی کثرت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۱ [2] فتوح البلدان ص ۳۶۷ مطبع مصریہ ازہر

کہ دور جاہلیت میں ان کے دونوں سرے ان سے اس قدر آباد تھے کہ ایک طرف عرب لوگ ابلہ (بصرہ) کو ارض الہند اور فرج الہند کے نام سے یاد کرتے تھے[1]، اور دوسری طرف عمان اور بحرین کے عرب باشندے ہندوستانیوں کی زبان و تہذیب اور حالات سے اس قدر باخبر اور متاثر تھے کہ عام عربوں کو ہندوستانیوں کے حالات ان قبائل کے ذریعہ معلوم ہوتے تھے، اور ہندوستانیوں کے میل جول سے ان عرب قبیلوں کی زبان اتنی بگڑ گئی تھی کہ عربیت میں اس کا درجہ اس قدر گر گیا تھا کہ فصاحت و بلاغت اور استعمال و محاورہ میں سند نہیں مانی جاتی تھی۔

چنانچہ مشہور عرب مورخ ہمدانی صاحب الاکلیل کا یہ قول علامہ قاضی ابن صاعد اندلسی نے طبقات الامم میں نقل کیا ہے،

ومن وقع من نصر من الازد بعمان فعنه اتی کثیر من اخبار السند والهند، وشئ من اخبار فارس[2]

اور قبیلہ نصر کا قبیلہ ازد جو عمان میں تھا اس سے سندھ اور ہندوستان کی بہت سی خبریں اور کچھ ایران کی خبریں معلوم ہوئیں۔

مصطفیٰ صادق الرافعی تاریخ آداب العرب میں "الرحلة الى البادیة" کے ماتحت لکھتے ہیں کہ عربی زبان و لغت کو زیادہ تر اعراب اور بدویوں خاص طور سے قیس اور تمیم سے لیا گیا ہے، مگر جن اعراب اور اہل بوادی کی زبان عجمیوں کے اختلاط کی وجہ سے خالص عربی نہیں رہ گئی، ان سے استناد و استشہاد نہیں کیا گیا،

وخاصة الذین کانوا یسکنون اطراف بلادهم المجاورة لمن حولهم من الامم فانه لایوخذ لا من لخم ولا من جذام لمجاورتهم اهل مصر والقبط ...... ولا من عبد القیس وازد عمان لانهم کانوا بالبحرین مخالطین للهند والفرس ولا من اهل الیمن لمخالطتهم للهند والحبشة[1]

خاص طور سے وہ عرب جو ایسے علاقوں میں بستے تھے جو پڑوس کی قوموں سے ملے ہوئے تھے، اسی لیے لخم اور جذام سے عربی زبان نہیں لی گئی کیونکہ وہ مصر اور قبط کے پڑوسی تھے، اور نہ عبد القیس اور ازد عمان سے لی گئی کیونکہ یہ لوگ بحرین میں تھے اور ہندوستانیوں اور ایرانیوں سے ان کا اختلاط تھا، یہی حال اہل یمن کا ہے، وہ بھی ہندوستانیوں اور حبشیوں سے میل جول رکھتے تھے،

---

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۱۰، طبقات ابن سعد ج ۷ ق ۱ ص ۲ تاریخ طبری اور کامل ابن اثیر ج ۲ [2] طبقات الامم ص ۷ طبع قدیم۔

بحرین کے قبیلہ عبد القیس کو ہندوستان کے باشندوں سے خاص تعلق تھا اور اسے کبھی کبھی ہندوستان کے لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا، ایک تغلبی شاعر اخنس ابن شہاب اپنے قبیلہ لکیز بن عبد القیس کی مدح میں لکھتا ہے:

لکیز لها البحران والسیف کله وان یاتها باس من الهند کارب[2]

بحرین اور عمان اور ان کے ساحلی مقامات میں ہندوستانیوں کے کثیر تعداد میں آباد ہونے کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد جب ان اطراف میں ارتداد کا طوفان اٹھا اور مختلف قبائل نے اسلام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس شورش میں ان علاقوں میں آباد ہندوستانیوں کو بھی جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے شریک کیا گیا، خاص طور سے قطیف، ہجر، خط دارین، اجوانا وغیرہ میں آباد جاٹ اور سیابجہ کو قبیلہ بنی عبد القیس کا ساتھ دینا پڑا،

---

[1] تاریخ آداب العرب ج ۱ ص ۳۴۳ [2] صفة جزیرة العرب ہمدانی ج ۱ ص ۱۵۴ بحوالہ عربوں کی جہازرانی ص ۳۰

امام طبری نے سنہ ۱۱ھ کے واقعات میں اہل بحرین کے ارتداد کے ذکر میں لکھا ہے

فلما مات النبی صلی اللہ علیہ وسلم	جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا
خرج الحطم بن ضبیعة	تو حطم بن ضبیعہ بکر بن وائل کے مرتدوں
أخو بنی قیس بن ثعلبة	اور دوسرے قبائل کے ان غیر مرتد کافروں
فیمن اتبعه من بکر بن وائل	کو جو ابتک اپنے مذہب پر قائم تھے
علی الردة، ومن تأشب	ساتھ لیکر نکلا، اور قطیف، و ہجر
الیه من غیر المرتدین	میں پہنچا اور خط کے پورے علاقہ کو
ممن لم یزل کافراً حتی نزل	اور وہاں پر آباد جاٹ اور سیابجہ
القطیف، وهجر، واستغوی	کو گمراہ کر کے اپنے ساتھ لے لیا
الخط ومن فیها من الزط	اور دارین کی طرف بھی فوج بھیجی
والسیابجة وبعث الی	
دارین[1]	

ان مرتدوں اور باغیوں نے جاٹوں اور سیابجہ کو لے کر ان اطراف میں بڑی شورش برپا کی اور مسلمانوں کا محاصرہ کر کے ہر طرف سے ان کی معاشی اور غذائی ناکہ بندی کر دی، حضرت علاء بن حضرمیؓ کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے حضرت جارودؓ کو بنو عبد القیس اور حطم کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا اور ایک سخت معرکہ آرائی کے بعد کامیاب ہوئے۔ اور حطم کی فوج کا ایک بڑا حصہ شکست کھا کر دارین کی طرف بھاگ نکلا، پھر وہاں سے بحری راستوں سے یہ سب اپنے اپنے ملک اور وطن کی طرف بھاگ گئے، ابن اثیر کا بیان ہے:

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۵۵، ۲۵۶، اور کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۴۱،

وقصد عظم الفلال الی	شکست خوردہ فوج کا بڑا حصہ کشتیوں کے
دارین فرکبوا الیها السفن و	ذریعہ دارین کی طرف گیا اور باقی ہزیمت خوردہ
لحق الباقون ببلاد قومهم[1]	اپنے اپنے مقامات پر چلے گئے۔

طبری کے الفاظ یہ ہیں:

وقصد العظم الفلال	ہزیمت خوردہ فوج کے بڑے حصے نے
لدارین فرکبوا فیها السفن	دارین کا رخ کیا اور وہاں سے کشتیوں
ورجع الآخرون الی بلاد	میں سوار ہو کر اپنی راہ لی اور دوسرے
قومهم[2]	سپاہی اپنے اپنے وطن چلے گئے،

ان دونوں مورخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ باغیوں اور مرتدوں کی شکست خوردہ فوج بھاری تعداد میں بھاگ کر دارین کی بندرگاہ پر آئی اور یہاں سے برّی اور بحری راستوں سے اپنے اپنے ملک کی طرف بھاگی، ظاہر ہے کہ اس میں ہندوستان کے جو جاٹ اور سیابجہ شریک تھے وہ بھاگ کر ہندوستان آئے ہوں گے،

(باقی)

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۴۲، [2] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۵۹

عربوں کی جہاز رانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے عربوں کی جہاز رانی کے موضوع پر بمبئی میں کچھ دیے تھے، اسی کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے، یہ سید صاحبؒ کی بہترین تاریخی کتابوں میں ہے جس میں انھوں نے اس موضوع سے متعلق تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ قیمت: ۔۔ ے ر

منیجر

دیوان ظہیر اور اس کا مصنف

از

جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خانصاحب صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی

اس عنوان سے میرے مضمون کے متعلق محترم خواجہ عبد الرشید صاحب نے معارف (جون ۱۹۶۲ء) میں جو اظہار خیال فرمایا ہے اس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں، چند باتیں اب بھی غور طلب معلوم ہوتی ہیں،

(۱) میں نے ظہیر فاریابی کا سال وفات پروفیسر براؤن (جلد دوم، ص ۴۱۳) کے قول کے مطابق عرض کیا تھا، خواجہ صاحب نے مطبع نول کشور کے ایک نوٹ کے مطابق دیا ہے، پھر میں نے کہیں یہ عرض نہیں کیا کہ نول کشور نے صرف ایک بار ۱۹۱۶ء میں دیوان ظہیر شائع کیا تھا۔ میں نے اپنے حوالہ کے لیے ضرور، اس سنہ کے اڈیشن کا ذکر کیا ہے۔

(۲) کیمیائے سعادت (جس کے مصنف کا سال وفات بھی میں نے دیا تھا) یقیناً ظہیر فاریابی سے پہلے کی ہے، وہ کتابیں جو ظہیر اصفہانی کے اشعار میں استعارۃً مذکور ہیں، ان میں کیمیائے سعادت بھی شامل ہے، یہی میرا مقصد تھا۔ اس جملے میں "کے علاوہ" رہ گیا ہے، یعنی اسے اس طرح پڑھا جائے:" کیمیائے سعادت (غزالی م ۵۰۵ھ ۱۱۱۱ء) مخزن اسرار (نظامی گنجوی، م ۵۹۹ھ ۱۲۰۲ء) کے علاوہ گلشن راز .... (الخ)"

اسی طرح حافظ شیرازی کا ایک مصرع جو ظہیر اصفہانی نے تضمین کیا ہے، وہ ظہیر فاریابی کے شعر میں نہیں ہو سکتا، اس بات پر پھر غور فرالیں۔

(۳) تخلص کے متعلق میں نے بھی وہی عرض کیا تھا جو خواجہ صاحب فرما رہے ہیں، یعنی میں نے یہی کہا تھا کہ چھٹی صدی ہجری میں تخلص شاذ ملتا ہے، لیکن التزام نہیں۔ میں نے چند شعراء کا ذکر کیا تھا کہ ان کے یہاں تخلص کا التزام نہیں، یعنی ان کی ہر غزل میں تخلص نہیں ملتا، ان شعراء میں انوری کو بھی شامل کیا تھا، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ

" انوری وغیرہ کے ہاں بھی (تخلص) ملتا ہے، اور کمال اصفہانی نے بھی استعمال کیا ہے، میرے پاس جو انوری کی کلیات ہے اس میں ہر تیسرے مقطع میں تخلص مل جاتا ہے۔"

یعنی خواجہ صاحب بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ہر غزل میں تخلص نہیں ہے، انھوں نے انوری کے ساتھ " وغیرہ" بھی ارشاد فرمایا ہے، لیکن اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ کمال اصفہانی کا حوالہ میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے یہاں تخلص کا التزام نہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے یہاں تخلص موجود ہے۔ چنانچہ میں نے کمال اصفہانی کا دیوان (مطبوعہ بمبئی) پھر اٹھا کر دیکھا، اس میں صفحہ ۱۸۱ سے صفحہ ۱۹۸ تک غزلیات بھی ہیں ان میں مجھے تخلص نظر نہیں آیا۔

(۴) خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ" ہو سکتا ہے کہ ظہیر فاریابی نے مخزن اسرار، گلشن راز شرح مطول وغیرہ تراکیب کا مناسب استعمال اپنے کلام میں پہلے کر لیا ہو، اور بعد میں لکھنے والوں نے ان تراکیب کو مستعار لے کر اپنی اپنی کتابوں کا نام رکھ لیا ہو۔ مثال کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر وغیرہ کا نام قرآنی تراکیب ہی سے تو لیا ہے،

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب بھی عرض ہے کہ وہ اشعار جن میں ان کتابوں یا ترکیبوں کا ذکر ہے وہ ظہیر فاریابی کے نہیں ہو سکتے، بلکہ زبان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعد کے ہیں اور ظہیر اصفہانی ہی کے ہوں گے، اگر خواجہ صاحب کے خیال کے مطابق وہ اشعار ظہیر فاریابی کے سمجھ لیے جائیں تو پھر اس شاعر کے ایسی مقبولیت کا ثبوت چاہیے جس کی وجہ سے ان کتابوں کے مقدس مصنفین نے ظہیر فاریابی جیسے درباری قصیدہ نگار کی تراکیب اپنی کتابوں کے نام کے لیے پسند کی ہوں۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے الفوز الکبیر (حجۃ اللہ البالغہ بھی) کا نام یا ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے اپنی بعض کتابوں کے نام قرآن پاک کی تراکیب کے مطابق رکھے ہیں، تو یہ سعادت ان کے لیے زیبا تھی، آج کل ضرور غالب یا اقبال کی تراکیب کے مطابق نام رکھے جاتے ہیں، لیکن یہاں چھٹی صدی ہجری کا ذکر ہے۔

بہر حال بڑی خوشی کی بات ہے کہ خواجہ صاحب نے میرا مضمون دلچسپی سے پڑھا اور متانت کے ساتھ اظہار خیال فرما کر اسے سراہا۔

دو نایاب تحریریں

(استدراک)

از جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی

مخدوم مکرم و محترم السلام علیکم

جون کا "معارف" ابھی شام کو ملا، ص ۴۶۵ - ۴۶۶ میں "تحریر شبلی" کے تعارف کے طور پر جو سطریں دیکھیں ان میں تصحیح کی ضرورت کی جگہ ہے:-

سفرنامۂ ابن بطوطہ کا ترجمہ اردو میں مولوی محمد حیات الحسن رضوی موہانی نے کیا تھا، سفرنامے کی دوسری جلد کا ترجمہ پیرزادہ محمد حسین صاحب ایم اے ڈسٹرکٹ جج پنجاب نے کیا تھا، جو لاہور میں چھپ کر تقریباً ۱۸۹۷ء میں شائع ہو چکا تھا، چونکہ دوسری جلد ہندوستان کی سیاحت پر مشتمل تھی، جج صاحب نے پہلی جلد کی طرف توجہ نہیں کی۔ اسی زمانے کے گرد و پیش میں ایک بہت مختصر خلاصہ (اردو میں) ایک صاحب نوازش علی نام نے لاہور میں شائع کیا تھا اور کم قیمت پر ملتا تھا۔ اسی کے بعد جج صاحب نے دوسری جلد بڑی آب و تاب سے لاہور میں شائع کی اور بہت جلد سارے ملک میں ابن بطوطہ کا نام مشہور ہو گیا تھا، حیات الحسن صاحب موہانی نے جو اس وقت ہنوز طالب علمی سے فارغ نہیں ہوئے تھے لیکن عربی کی قابلیت اچھی رکھتے تھے، اپنے والد مولانا حکیم احمد سعید صاحب موہانی کی امداد اور نگرانی میں پوری کتاب کا ترجمہ کیا، حکیم صاحب علاوہ ماہر طبیب ہونے کے عربی کے اچھے ادیب تھے، ان کے بڑے بھائی

مولوی لطف حسن صاحب مختلف اضلاع حیدر آباد میں ججی کے عہدے پر فائز رہے تھے، سب سے چھوٹے بھائی شریف الحسن صاحب عدالت عالیہ سرکار عالی کے جج تھے، جنھوں نے ۱۸۹۳ء کے قریب انتقال کیا، اور یہ تینوں صاحب سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کے حقیقی ماموں تھے، حیات الحسن صاحب کے ترجمے کی پہلی جلد منشی انشاء اللہ مدیر وکیل امرتسر نے غالباً ۱۹۰۱ء میں یا کچھ بعد شائع کر دی تھی، لیکن دوسری جلد کو شائع کرنا انھوں نے اس لیے نہیں چاہا، کہ محمد حسین صاحب جج پنجاب کا ترجمہ شائع ہو چکا تھا، ۱۹۲۱ء میں مجھے پروفیسر مارگولیتھ نے اوکسفورڈ سے لکھا کہ ہندوستان میں ابن بطوطہ کے سفرنامے کا ترجمہ اردو میں ہوا ہے، اس کی ضرورت ہے، میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پہلی اور دوسری دونوں نایاب ہیں، حیات الحسن صاحب نے ایک نسخہ مجھے پہلی جلد کا دیا اور بتایا کہ دوسری جلد شائع نہیں ہوئی، پہلی جلد کا ترجمہ میں نے مارگولیتھ کو بھیجدیا،

حیات الحسن صاحب مرحوم کے ایک بھائی حمایت الحسن صاحب محکمۂ تعلیمات صوبہ متحدہ میں ملازم تھے، اور بنارس میں کئی خدمتوں پر رہ کر وظیفہ یاب ہوئے، تیسرے بھائی ہدایت الحسن جوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے، مجھے ان سب صاحبوں کی خدمت میں نیاز حاصل تھا، "نعمانی" ظاہراً "موہانی" کی تصحیف ہے۔

مطبوعات جدیدہ

فضل اللہ الصمد توضیح الادب فی المفرد } از مولانا فضل اللہ الجیلانی، استاذ جامعہ عثمانیہ جلد اول صفحات ۴۰۸، جلد دوم صفحات ۷۳۵، عمدہ عربی ٹائپ

ناشر الحاج یوسف زینل حجاز، پتہ اور قیمت درج نہیں،

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کے علاوہ جو علمی و دینی تصانیف چھوڑی ہیں، ان میں ایک اہم کتاب الادب المفرد بھی ہے، یہ کتاب ہر زمانہ اور ہر دور میں مقبول اور متداول رہی ہے، لیکن بقول صاحب کشف الظنون یہ افسوس ہے کہ اس کتاب کی شرح تو کیا اس کا کوئی مفصل حاشیہ بھی نہیں لکھا گیا، امام سیوطی نے اس کا خلاصہ کیا تھا مگر وہ بھی ناپید ہے، ہندوستان کے علماء نے حدیث نبویؐ کے سلسلہ میں جو امتیازی اور غیر مفرغ عنھا کام کیا ہے اس کی ایک تازہ مثال مولانا فضل اللہ صاحب رحمانی کی شرح ادب المفرد ہے، یہ کتاب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کئی بار طبع ہو چکی ہے، مگر اس کی تصحیح کا پورا اہتمام کبھی نہیں کیا گیا۔ مصنف نے کتاب کی شرح کے ساتھ اس کے متن کی صحت کا بھی پورا اہتمام کیا ہے، ان کو جتنے متداول مطبوعہ اور قلمی نسخے مل سکتے تھے وہ سب انھوں نے اپنے سامنے رکھکر اس کی تصحیح کی ہے، اور جہاں ضرورت ہوئی ہے دوسری کتابوں سے بھی مدد لی ہے، اس کتاب کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ (۱) اس کتاب کی نصف حدیثیں صحیح بخاری اور نصف صحیح مسلم کے معیار کی ہیں (۲) بعض

احادیث جن کو صحیح میں انھوں نے تعلیقاً نقل کیا ہے، اس میں متصل سند سے اس کا ذکر کیا ہے، (۳) آداب اسلامی کے سلسلہ کی احادیث میں جہاں محدثین سے سند یا متن میں ذہول ہو گیا ہے اس کی نشاندہی بھی کرتے گئے ہیں (۴) آداب اسلامی اور اخلاق نبوی کا جتنا اچھا ذخیرہ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے،

شارح نے ان تمام خصوصیات کو پیش نظر رکھکر مختصر مگر بہت جامع شرح لکھی ہو، اس میں حدیث کے غریب الفاظ کی تشریح بھی ہے اور مفہوم و معانی کی تعیین بھی، سند و متن پر محدثانہ انداز میں کلام بھی کیا ہے اور رواۃ کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں، فقہا کے اختلاف مسالک کا بھی ذکر کیا ہے، مگر ساتھ ہی اس اختلاف کو رفع کرنے اور اس میں تطبیق دینے کی کوشش بھی کی ہے، اور ان سب سے بڑھ کر حدیث نبوی کے اخلاقی و عملی پہلوؤں پر کمیت و کیفیت دونوں لحاظ سے بڑے لطیف انداز میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے.

مولانا فضل اللہ صاحب نے یہ شرح لکھکر شروح حدیث کے ذخیرہ میں ایک نیا اور عمدہ اضافہ کیا ہے، جس کے لیے وہ تمام علماء و طلبائے علم حدیث کیطرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں.

تاریخ سلسلۂ فردوسیہ ۔ از معین الدین دردائی، صفحات ۲۷۴ کتابت وطباعت عمدہ، پتہ محمد مظفر الدین صاحب محلہ خانقاہ بہار شریف، قیمت چھ روپئے۔

جن سلاسل صوفیا کے ذریعہ اسلام کا روحانی و اخلاقی فیض ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچا، ان میں ایک سلسلۂ فردوسیہ بھی ہے، جس کے گل سرسبد مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ ہیں، اس سلسلہ کا فیض یوں تو پورے ہندوستان میں پہنچا، مگر خاص طور پر سرزمین بہار کا تو چپہ چپہ اس سے مستنیر ہوا، اس کتاب میں محمد معین الدین دردائی صاحب نے اسی پرسعادت سلسلہ کے ۱۳ بزرگوں کے حالات و کارناموں کی تفصیل کی ہے، کتاب کا تعارف سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

نادر پیش لفظ اور دیباچہ مصنف نے لکھا ہے، سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگوں کے حالات عام تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں، مصنف نے ۵۰ سے زیادہ مطبوعہ اور قلمی کتابوں کی مدد سے ان کے مفصل حالات لکھے ہیں، خاص طور پر مخدوم الملک احمد یحییٰ منیر رحمۃ اللہ علیہ کے حالات انھوں نے جس تفصیل سے لکھے ہیں اتنی تفصیل سے ابتک کسی نے نہیں لکھے ہیں پھر مصنف نے خرق عادت باتوں اور خواب و منام کے قصوں کے ذکر میں بھی اعتدال سے کام لیا ہے اور جو بات لکھی ہے پوری تحقیق و تفتیش سے لکھی ہے، خاص طور پر کتاب کا تعارف، پیش لفظ اور دیباچہ کے پڑھنے سے معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوتا ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی کتاب اچھی ہے، اگر مصنف نے عرس و سماع کے ذکر میں ذرا اور احتیاط سے کام لیا ہوتا تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی۔ امید ہے کہ کتاب دینی حلقہ میں ذوق و شوق سے پڑھی جائے گی،

معرفت الٰہیہ ۔ از مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری، صفحات ۴۴ کتابت وطباعت عمدہ، ناشر خانقاہ اشرفیہ، سب بلاک جی ناظم آباد نمبر ۲ کراچی ۱۸۔

مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلفاء میں ہیں، مدتوں وہ اعظم گڈھ میں رشد و ہدایت کا کام کرتے رہے، ادھر کچھ دن سے وہ پاکستان منتقل ہو گئے ہیں، مولانا اپنی مجالس میں حکمت و معرفت کی جو باتیں ارشاد فرماتے رہتے ہیں، ان کو ان کے بعض مسترشدین جمع کرتے رہتے ہیں اور مرتب کرکے کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں، اس مجموعہ میں مولانا نے معرفت الٰہیہ کی حقیقت، اس کے حصول کی صورت اور اس کے مظاہر وغیرہ پر بڑی لطیف و دل گداز بحثیں کی ہیں، کتاب کے ایک ایک جملے سے للّٰہیت اور خدا ترسی ٹپکتی ہے، اس کے پڑھنے سے قلب میں طمانیت اور آخرت طلبی پیدا ہوتی ہے، مرتب نے مولانا کے جو حالات لکھے ہیں ان میں بعض باتوں کا علم شاید ان کے بہت قریبی لوگوں کو بھی نہ ہو،

کتاب بار بار پڑھنے کے لایق ہے، مولانا گو جسمانی لحاظ سے ہم سے دور ہو گئے ہیں، مگر اس کتاب کے ذریعہ انشاء اللہ ان کے روحانی فیض سے ہمیں برابر مستفیض ہونے کا موقع ملتا رہے گا،

عبدالرحمٰن ابن خلدون — صفحات ۳۲۵ از ڈاکٹر عبدالواحد وافی
جابر بن حیان — صفحات ۳۰۲ از ڈاکٹر زکی نجیب محمود
المعتمد ابن عباد — صفحات ۳۴۵ از علی ادہم

ناشر مکتبہ مصر ۳ شارع کامل صدقی الفجالہ،

یہ تینوں کتابیں جمہوریہ عربیہ کے شعبۂ ثقافتی معاملات کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، پہلی کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ابن خلدون کے حالات وعلمی اور عملی کارناموں کی تفصیل ہے، دوسری کتاب میں مشہور فلسفی اور کیمسٹ جابر بن حیان کے حالات اور اس کے علمی کارناموں کا ذکر ہے، اور تیسری کتاب میں مغرب کے معروف شاعر و ادیب المعتمد ابن عباد کے ادبی و شاعرانہ کاموں اور خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، ان پر اس سے بھی زیادہ مفصل کتابیں لکھنے کی ضرورت تھی، پھر بھی عرب جمہوریہ کا شعبۂ ثقافت قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ان پر کام کی ابتدا کر دی ہے، یورپ نے اپنے زور قلم سے معمولی معمولی آدمیوں کی دلوں میں غیر معمولی اہمیت بٹھا دی ہے، مگر بدقسمتی ہے کہ تاریخ اسلام کی بعض بڑی بڑی شخصیتوں سے بھی دنیا ناواقف ہے، اس لحاظ سے یہ بڑا قابل قدر کام ہے۔

م - ج

جلد ۹۰ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۲ء عدد ۲

مضامین